ترتیب دینے والے

شمس الرحمٰن فاروقی، حامد حسین حامد

شب خون کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد ۳

ناشر : سید رشید قادر

پرنٹر : عبدالمجید اسرار کریمی پریس الہ آباد

کتابت : شب خون رقم الہ آباد

سرورق کا آرٹسٹ : نایاب الہ آباد

سرورق کا پریس : نیشنل پرنٹنگ ورکس الہ آباد

پہلا ایڈیشن

تعداد : ایک ہزار

تاریخ طباعت : اکتوبر ۶۷

قیمت : چار روپے

جمیلہ فاروقی کے نام

شمس الرحمٰن فاروقی

ترسیل کی ناکامی کا المیہ

انسان اور جانور کے درمیان آخری اور شاید اکیلی حدِ فاصل قوتِ ترسیل ہے۔ لیکن ترسیل اتنا سادہ اور یک سطحی عمل نہیں ہے جتنا بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے۔ ترسیل ایک اضافی اور محدود عمل ہے۔ گفتگو میں بہت سی باتیں ہم بے کہے سمجھ جاتے ہیں، اور بہت سی باتیں کہنے پر بھی سمجھ میں نہیں آتیں کیوں کہ بولنے اور سننے والے کے درمیان مشترک نسب نما common denominator مفقود ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم جس نسب نما کو مشترک سمجھ کر اس کا گفتگو پر اطلاق کرتے ہیں وہ درحقیقت مشترک نہیں ہوتا، چنان چہ کہا کچھ جاتا ہے اور سمجھا کچھ جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کہی ہوئی بات کے کئی معنی ہوں، لیکن ہم تک اسی معنی کی ترسیل ہو جس کے جراثیم ہمارے ذہن میں پہلے سے موجود ہوں۔

چیسٹرٹن کے ایک افسانے میں لغوی اور غیر لغوی ترسیل کے مسئلہ کی ایک اچھی مثال ملتی ہے۔ ایک شخص اپنے گھر میں قتل کیا ہوا پایا جاتا ہے۔ پولیس کی تحقیقات پر بار بار یہی جواب ملتا ہے کہ مقتول کے کمرے میں دن بھر کوئی نہیں گیا۔ عمارت کا چوکی دار، سامنے کی دوکان والے لوگ، سب بہ اصرار یہی بیان دیتے ہیں کہ مقتول دن بھر اکیلا رہا۔ لیکن اگر وہ دن بھر اکیلا رہا تو کیا اس کا قتل کسی آسمانی ایجنسی کے ذریعہ ہوا؟ پولیس انسپکٹر پولیس انسپکٹر بار بار سوال کرتا ہے: "مقتول سے ملنے کون کون آیا تھا؟" یا "مقتول کے یہاں کون کون آیا تھا؟" ہر بار جواب ملتا ہے: "کوئی نہیں۔" آخر کار فادر براؤن کسنے والوں کو الگ الگ طبقوں میں بانٹ کر پوچھتا ہے: "کوئی دوست آیا تھا؟" "نہیں۔"

"کوئی ملازم آیا تھا؟" — "نہیں۔" "کوئی اخبار والا؟" — "نہیں۔" "پوسٹ مین؟" — "ہاں!" اس طرح پوسٹ مین پر شک ثابت ہو جاتا ہے۔ لیکن "مقتول کے یہاں کون کون آیا تھا؟" یا "مقتول سے ملنے کون کون آیا تھا؟" کا جواب اب بھی "نہیں" رہتا ہے کیونکہ جب ہم "کون آیا تھا؟" کا جواب دیتے ہیں تو عام طور پر ہمارے ذہن میں ملنے والوں، ملاقاتیوں، کسی کام کے آنے والوں، وغیرہ کا تصور رہتا ہے۔ لہذا ہم بھنگی، مہتر، ڈاکیہ، سبزی والا، اس قسم کے لوگوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ سوال اور جواب دونوں اپنی جگہ صحیح رہتے ہیں لیکن پھر بھی مکمل ترسیل نہیں ہو پاتی۔

شیلی نے اپنی نظم Epipsychidion کے "اشتہار" (دیباچے) میں ترسیل کی دوسری شکل، یعنی مشترک نسب نما کی غیر موجودگی، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> "ڈینٹی کی Vita Nouva کی طرح میری یہ نظم بھی قارئین کے ایک طبقے کے لئے قابل فہم ہے، چاہے وہ ان حالات و واقعات کے احوال واقعی سے واقف نہ ہوں جن کا اس نظم میں ذکر کیا گیا ہے، ہاں، ایک طبقہ ضرور ایسا ہے جن کے لئے یہ نظم ہمیشہ ہمیشہ ناقابل فہم رہے گی، کیوں کہ اس میں مذکورہ تصورات کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے [میرے اور ان کے درمیان] کوئی مشترکہ قدر نہیں ہے۔"

یہاں ہمیں شعر کے ابہام یا الجھاوے سے بحث نہیں ہے، ہماری بحث اس بنیادی مشکل سے ہے جو مکمل، یا صحیح لیکن نامکمل، ترسیل کی کوشش میں از خود پنہاں رہتی ہے۔

غلط نسب نما کو مشترک سمجھ لینے کے نتیجے میں جو الجھاوے پیدا ہوتے ہیں ان کی مثال بے معنویت کے ڈراما میں بہت اچھی ملتی ہے۔ مثلاً ہیرلڈ پنٹر Harold Pinter کے ڈرامے[1] The Dumb Waiter کا آغازی مکالمہ دیکھئے:

بن: کا آ! (اخبار اٹھاتا ہے) یہ دیکھا تم نے؟ (وہ اخبار پر نظر ڈال کر کہتا ہے) اسّی برس کا ایک آدمی سڑک پار کرنا چاہتا تھا۔ مگر سڑک پر بھیڑ بہت تھی، سمجھے؟ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ وہ کس طرح دب دبا کر نکل جائے۔ اس لئے وہ ایک لاری کے نیچے رینگ گیا۔

---

[1] dumb waiter = وہ الماری جس پر کھانا یا برتن رکھ کر کھانے کے کمرے میں لایا جاتا ہے۔

گس : وہ ــــ کیا؟

بن : وہ ایک لاری کے نیچے رینگ گیا۔ کھڑی ہوئی لاری۔

گس : نہیں؟

بن : لاری اسٹارٹ ہوئی اور اس پر سے گذر گئی۔

گس : جاؤ جاؤ۔

بن : اخبار میں تو یہی لکھا ہے۔

گس : اماں جاؤ جاؤ۔

بن : سوچ کر متلی آنے لگتی ہے، ہے کہ نہیں۔

گس : اس سے ایسا کرنے کو کہا کس نے؟

پہلے تو گس، بن کی بات سنتا ہی نہیں۔ اور جب سنتا ہے تو یقین نہیں کرتا۔ بن حیرت اور افسوس کا اظہار کر رہا ہے، گس لاپروائی اور بے یقینی کا۔ اور جب بن افسوس اور کراہیت کا اظہار کرتا ہے تو گس جاننا چاہتا ہے کہ بوڑھے نے ایسا کیا ہی کیوں؟ دونوں ساتھی ہیں، ہم پیشہ ہیں، ایک ساتھ رہتے ہیں، لیکن ایک، دوسرے کے تحت معنی کو سمجھ نہیں پاتا۔

پہلے سے طے شدہ معنی ذہن میں محفوظ ہونے کی وجہ سے ترسیل میں ناکامی کی ایک مثال دیکھیے[12] بوڑھا باپ جو کہن سالی کی وجہ سے اپنے حواس تقریباً کھو بیٹھا ہے، اور جوان بیٹی۔ جوان بیٹا ہے، لیکن باپ کو چھوڑ کر سلون بھاگ گیا ہے۔ بیٹی بھائی سے خط و کتابت رکھتی ہے، لیکن باپ سے نہیں بتاتی۔

باپ : بوڑھے لوگ خود غرض ہوتے ہی ہیں۔

بیٹی : انھیں نہیں ہونا چاہیے۔ تم تو اس طرح بات کرتے ہو جیسے بڑھاپا احمقانہ طور طریقے اختیار کر لینے کا لائسنس ہو۔ ایسا تھوڑا ہی ہے۔

باپ : میں اس کا باپ ہوں۔

بیٹی : اب زیادہ نہ بولو۔

باپ : میں بہت بڈھا ہوتا جا رہا ہوں۔

---

[12] نشل انڈیا میں ایک سوسن کا پھول (ڈراما : ڈونلڈ ہاورتھ)

بیٹی : آج کا اخبار پڑھو۔ دیکھو وہ رہا۔
باپ: مجھے پچھلے ہفتے والا نہیں ملا۔
بیٹی : میں نے پھینک دیا۔
باپ: لیکن میں تو ابھی معمہ حل کر رہا تھا۔
بیٹی : کل نیا معمہ آئے گا۔

لڑکی بے درد یا خود غرض نہیں ہے۔ لیکن بڑھاپے کی زبان اور ہوتی ہے، جوانی کی اور۔ بوڑھا باپ بیٹے سے محبت کو کسی اور معنی میں خود غرضی کہتا ہے، لیکن بیٹی کے ذہن میں پہلے سے کوئی اور معنی موجود ہیں۔ بیٹی کے لئے ہر معمہ برابر ہے، پچھلے ہفتے والا پھینک گیا تو کیا ہوا، اگلے ہفتے پھر آجائے گا۔ باپ اپنے بوڑھے ہونے کو ایک افسوسناک ناامیدی کی زبان میں ظاہر کرتا ہے، بیٹی کے لئے "میں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں" کے معنی یہ ہیں کہ وہ بوڑھا ہے اس لئے بےکار ہے، اور اخبار پڑھنے کے علاوہ کسی کام کا نہیں۔
اس طرح لمحہ لمحہ زندگی کے ہر موڑ پر ہمیں ترسیل کی ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔
جن باتوں کے بارے میں ہمارا گمان ہوتا ہے کہ ہم انھیں سمجھتے ہیں، درحقیقت ہم انھیں بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتے۔ جب ترسیل ناکام ہوتی ہے تو ابلاغ بھی ناکام ہوگا۔ شاعر کے ساتھ مشکل یہی ہے کہ وہ لفظوں میں گفتگو کرتا ہے اور الفاظ مکمل ابلاغ کی حد تک کبھی نہیں پہنچ پاتے۔

بیا در دیگریں جا بود زبان دانے　　　غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　　　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

ترسیل کا جذبہ شاعری کا محرک ہے۔ لیکن ترسیل کبھی مکمل ابلاغ کو جنم نہیں دیتی۔ اس کی خاص وجہیں میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اگر آپ مکمل ابلاغ کو سو اکائیاں فرض کریں تو کامیابی کی سطح اسی یا نوے سے زیادہ اوپر نہیں جاتی۔ اور یہ بھی اسی وقت ہوتا ہے جب شاعر اپنے زمانے سے ہم آہنگ ہو اور اس کی زبان و فکر کا مزاج اپنے ہم عصروں کی زبان و فکر کے مزاج سے بہت الگ اور بہت دور نہ ہو۔ لیکن ایسے عہد میں جب خود عام زبان میں ترسیل کی قوت اس قدر کم ہو گئی ہو کہ عام بول چال سے بچھڑے ہوئے معنی کے تلازماتی انقیر کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہوں، شاعر کو اجنبیت کا احساس زیادہ شدت سے ہونے لگتا ہے۔
دوسری طرف جب بہ قول ورڈز ورتھ، بیس میں سے مشکل سے ایک آدمی بھی ایسا نکلے گا جو شعر

کا صحیح لطف اٹھانے پر قادر ہو، اور جب بہ قول ورلن، شاعروں کی عمیق معنویت سے پریشان
ہو کر دنیا، شاعروں کو ملک بدر کر دیتی ہو، اور بدلے میں شاعر دنیا کو ملک بدر کر دیتے ہوں، اور
جب بہ قول آڈن رگ

> آرٹس اور سائنس کی مہارت حاصل کرنے کے لئے چکرا دینے والی کتابوں
> اور وسائل کے درمیان دوڑتے اور گھومتے ہیں، اور وہ اعصاب جو قتل
> و غارت گری کے بھیانک مناظر سے جھجکے یا ٹھٹکے نہیں، ڈن Donne کی
> مختصر نظموں کے سامنے پارہ پارہ ہو جاتے ہیں!

شاعر کا کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اول تو شعر کی زبان کی ترکیب، وضع اور مشینری بالکل مختلف
(اور اکثر) عام زبان کے مقابلہ میں بے رحمی سے توڑی پھوڑی ہوئی، کھینچی تانی ہوئی اور
نامانوس ہوتی ہے۔ (ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس پر آگے میں کچھ اشارے کروں گا۔) دوئم یہ کہ
مادی زندگی کی ترقی اور مادی بہتری کے وسائل کی فراوانی کی وجہ سے زبان خود اپنے شعری
امکانات کھو بیٹھتی ہے یا ان امکانات میں تخفیف کی اجازت دے دیتی ہے۔ ریڈیو سیلون
کے اشتہاروں اور فلمی گانوں اور ریڈیائی تقریروں پر پلی ہوئی زبان اور اس زبان میں پالی
پوسی نسل شاعرانہ زبان میں گفتگو نہیں کر سکتی۔ اس نسل کی زبان تو کچھ اس طرح کی ہوگی جس
کی مثال میں نے ڈونلڈ ہاورتھ اور ہیرلڈ پنٹر کے ڈراموں سے پیش کی۔ آئرستانی ڈراما نگار
جے۔ ایم۔ سنج نے اس حقیقت کی طرف بڑی خوبی سے اشارہ کیا تھا کہ عوام کی زبان جب
تک شہری زندگی کے اثر سے گندی اور مخرب corrupt نہیں ہو جاتی، وہ شاعرانہ زبان
رہتی ہے۔ اس نے کہا کہ آئرستان کی عام بولی میں جو خوشبو اور دھن ہے، اس کی مثال
انگلستانی انگریزی میں نہیں ملتی۔ والیری نے اس نکتہ پر بڑی اچھی بات کہی ہے:

> بچپن میں حاصل کی ہوئی زبان جو بچہ کو ورثہ میں ملتی ہے اپنی اعدادی
> اور اشتراکی statistical and communal نوعیت کی وجہ سے فکر و خیال
> کے ان رنگوں اور پہلوؤں کو ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے جو عملی زندگی سے
> الگ اور دور ہیں۔ ایسی زبان روزمرہ زندگی کے مقاصد کے علاوہ اور کسی
> زیادہ باریک، ناپے تلے اور عمیق مقصد کے لئے بہت ہی کم حد تک کام آ سکتی
> ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تکنیکی زبانیں وجود میں آتی ہیں — اور ادبی زبان ان

میں سے ایک ہے۔

لہٰذا شاعری کے ارتقا کی دو منزلیں ہیں۔ ایک تو جب شاعر اپنے دور سے بہت حد تک ہم آہنگ ہوتا ہے اور اس کی زبان اپنے عہد کی زبان سے بہت دور نہیں ہوتی۔ ایسے زمانے میں شاعر نسبتہً زیادہ ابلاغ کا اہل ہوتا ہے اور ترسیل کی مسرت اس کے شعر کا موضوع ہوتا ہے۔ ایسے عہد میں شاعر جذباتی اور ذہنی مسائل کو الجھانے سے زیادہ سلجھانے کا کام انجام دیتا ہے۔ دوسری منزل میں شاعر کی زبان اپنے عہد کی زبان سے دور ہونے کی وجہ سے اور اس سے نزدیک تر ہونے کی کوشش میں معروف ہونے کی وجہ سے نسبتہً کم ابلاغ کی اہل ہوتی ہے۔ ایسی شاعری کا سرچشمہ ترسیل کی ناکامی سے پیدا ہونے والے المیہ کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے عہد کی شاعری جذباتی اور ذہنی الجھنوں کا سادہ اور آسان حل بتانے سے قاصر رہتی ہے۔ کیوں کہ ہر الجھن کا حل یہ ہے کہ اس کو وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔ فرائڈ نے اپنے پورے نظریۂ تجزیۂ نفس کی اساس ہی اس اصول پر رکھی تھی، لیکن شاعر کو اس حقیقت کا عرفان فرائڈ کے ہزار ہا برس پہلے سے تھا اور اب بھی ہے۔ آج کا شاعر چوں کہ ترسیلی زبان کی ناکامی کی وجہ سے اپنی الجھنوں کو واضح الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہے، اس لئے وہ ان کا حل بھی نہیں ڈھونڈ پایا۔ ایسی شاعری زندگی کا شعور تو دیتی ہے، کیوں کہ تمام شاعری کا مقصد یہ ہے کہ وہ قاری کو زندگی کا علم و عرفان عطا کرے، لیکن ایسی شاعری قاری کو زندگی سے پرسکون ہم آہنگی یا احساس صلح نہیں عطا کر پاتی۔

ترسیل کی نسبتہً کم ناکامی اور نتیجہ میں ترسیل کی مسرت۔
ترسیل کی نسبتہً زیادہ ناکامی اور نتیجہ میں نا ترسیل کا المیہ۔

نئی اور پرانی شاعری میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اس حقیقت کو یہ کہہ کر نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ ناترسیل کی شاعری خراب ہوتی ہے یا لغو ہوتی ہے یا دل پر اثر نہیں کرتی۔ یہ سوال تو ہم بعد میں طے کریں گے، لیکن یہاں بہت صفائی سے اتنا کہہ دینا بہت ضروری ہے کہ نیا اور اچھا ہم معنی نہیں ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح پرانا اور اچھا بھی ہم معنی نہیں ہیں۔ اگر میراجی غالب کے مقابلہ میں نئے شاعر ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ میراجی، غالب سے بہتر بھی ہوں۔ اگر ولی اورنگ آبادی، غالب سے پرانے شاعر

ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ ولی، غالب سے بہتر بھی ہوں۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ شعر کی زبان، روزمرہ زبان کے مقابلے میں زیادہ ڈرامائی ہوتی ہے اور اس کی وضع روزمرہ کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ اردو اس معاملے میں ایک حد تک خوش قسمت رہی ہے کہ اردو روزمرہ اور محاورہ بھی شعر کی مانی ہوئی زبان کا ایک حصہ تھے۔ لیکن یہاں دو اہم نکات اٹھتے ہیں :

(۱) کہا جاتا ہے کہ داغ سے زیادہ محاورے کسی اردو شاعر نے نظم نہیں کئے، اور داغ کے علاوہ بھی محاورات کا استعمال پچھلی صدی کے اردو شاعروں نے خاطرخواہ استعمال کیا ہے۔ اب اس صدی کے بڑے شعرا کا نام لیجئے : حالی، اقبال، جوش، فراق، فیض احمد فیض، جگر وغیرہ۔ ان میں سے کس شاعر نے محاورہ اور روزمرہ استعمال کیا ہے؟ اور کس حد تک؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بھی شاعر نے داغ کیا، ذوق اور مومن کیا، محاورہ سے دور بھاگنے والے کسی شاعر (مثلاً غالب) کے برابر بھی محاورہ اور روزمرہ نہیں استعمال کیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ جواب بالکل صاف ہے : کیوں کہ اس صدی میں اردو کی عام زبان اور شاعرانہ زبان کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا تھا، اور یہ فاصلہ اب بھی بڑھ رہا ہے۔ جس عمل کی کارفرمائی سنج Synge نے ۱۹۲۰ کے انگلستان اور آئرستان میں دیکھی تھی، وہی عمل ہمارے یہاں بھی رونما ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس صدی کے مشہور قدامت پرست شعرا مثلاً آنند نرائن ملا، جعفر علی خاں اثر، حسرت موہانی (اور تیسرے درجہ کے شعرا میں ابر احسنی، مانی جائسی، سائل دہلوی وغیرہ) نے اپنے شعر کی زبان میں محاورہ اور روزمرہ کو زیادہ راہ نہیں دی ہے۔

(۲) دوسرا نکتہ یہ ہے کہ خود محاورہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ استعارہ جب مردہ ہو جاتا ہے تو شعر کی زبان اسے خارج کر دیتی ہے اور وہ محاورہ بن جاتا ہے۔ اقتصادیات کا مشہور قانون کہ خراب سکے اچھے سکوں کو بازار سے باہر نکال دیتے ہیں، شعر کی دنیا پر دوسری طرح صادق آتا ہے۔ نیا استعارہ پرانے استعارے کو محاورہ بنا دیتا ہے اور اسے ملک بدر کرتا ہے۔ ورنہ دل ٹوٹنا، آنکھ لڑنا، پانی پانی ہونا، سبز باغ دکھانا، ہوا باندھنا وغیرہ ہزارہا محاوروں نے کیا بگاڑا تھا کہ ان کو اب شعر میں استعمال کرنے سے آنند نرائن ملا بھی گھبراتے ہیں۔ کیا یہ استعارے نہیں ہیں؟ دل بھلا کب ٹوٹتا ہے؟ اور آنکھ کیوں کر لڑتی ہے؟

آدمی پانی میں کہاں تبدیل ہوتا ہے؟ یہ سب استعاراتی بیانات ہیں، لیکن کثرت استعمال کی وجہ سے ان کی استعاریت مردہ ہو گئی ہے۔ اب یہ محاورے بن کر زبان کی تلاطم گدلی سطح پر بے مدعا تیرتے پھرتے ہیں۔

لہذا آئیڈیل حالات میں بھی شعر کی زبان کا سفر عوامی زبان کی الٹی سمت ہی میں ہوتا ہے۔ اس لئے شعر کو سمجھنا اس وقت ممکن ہے جب اس کی زبان کے اس بنیادی مشینی اصول کو سمجھ لیا جائے۔ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، آج کے حالات شعر کے لئے آئیڈیل نہیں ہیں۔ (یا یوں کہیں کہ نسبتاً کم آئیڈیل ہیں۔ کیوں کہ غالب اور میر کے زمانے میں بھی حالات آئیڈیل نہیں تھے) لہذا شعر اسی وقت ممکن ہے جب اس کی زبان عام وضع سے بدلی ہوئی اور ٹوٹی پھوٹی ہو۔ "ٹوٹی پھوٹی" پر چونکنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ استعارہ زبان کی توڑ پھوڑ کے علاوہ اور کوئی عمل نہیں کرتا۔ دل کوئی مٹی کا پیالہ نہیں جو ٹوٹ جائے، لیکن استعارہ دل کو توڑ دیتا ہے۔) اور شعر میں ابلاغ اسی وقت ممکن ہے جب قاری خود کو شاعر کی جگہ رکھ کر اشیاء و افعال کو دیکھے اور زبان کو شاعر کی طرح استعمال کرنا سیکھے۔ اور چوں کہ قاری اشیاء اور افعال کو ہو بہ ہو شاعر کی طرح نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی زبان کو ہو بہ ہو شاعر کی طرح استعمال کر سکتا ہے (ورنہ خود وہ شاعر نہ ہو جاتا؟) اس لئے بہترین حالات میں بھی مکمل ابلاغ ممکن نہیں۔ اور چوں کہ آج کے قاری کا نقطۂ نظر اور زبان کے متعلق اس کا رویہ، آج کے شاعر سے بہت زیادہ مختلف ہے، اس لئے ابلاغ کی سطح اور بھی نیچی ہو جاتی ہے۔

یہ مسئلہ ہر دور میں ہر اس شاعر کے ساتھ پیش آیا ہے جس نے نئی ہوش مندی کا اظہار کیا ہے۔ میں نے اوپر شیلی کا حوالہ دیا ہے، ۱۸۲۱ میں اسے اس بات کا احساس تھا، لیکن دھندلے طریقے سے۔ غالب کو بھی شکایت تھی، لیکن وہ اس کی وجہ نہ ڈھونڈ پائے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار (غالباً) پیارے صاحب رشید کو اقبال کا کلام سنا کر ان کی رائے طلب کی گئی تو انھوں نے جواب دیا کہ میں رائے کیا دوں۔ یہ شاعری تو اردو میں تھی ہی نہیں، یہ زبان ہی کچھ اور تھی!

ہر عہد کا نیا شاعر اپنے ہم عصروں کی نگاہ میں ناقابل فہم، الجھا ہوا، مشکل اور مبہم ہوتا ہے، جب کہ اس کے فوراً بعد آنے والی نسل اسے بہ خوبی سمجھ لیتی ہے اور اس کے کلام

پر سر دھنتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ شعر کی تاریخ کا ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ غالب، اقبال، ترقی پسند تحریک، راشد، میراجی، نئی شاعری — عہد بہ عہد ان کو مشکل اور مبہم کہا گیا ہے لیکن اقبال کی نسل نے غالب کو مبہم اور لایعنی نہیں کہا۔ ترقی پسند نسل نے اقبال کو لغو کہا ہو، لیکن مشکل نہیں کہا۔ ہم بھی میراجی کے حلقہ بہ گوش نہ ہوں، لیکن ہمیں ان کی شاعری بہت مشکل نہیں نظر آتی۔ مغربی ادب میں یہ صورت حال اور زیادہ شدید اور تشدد آمیز رہی ہے اور صدیوں سے موجود ہے۔ نئے شاعروں نے اس سوال کا جواب یہ کہہ کر دینے کی کوشش کی ہے (اس بدعت کا آغاز ترقی پسندوں نے کیا تھا) کہ ہر دور میں ادب کی قدریں بدلتی رہتی ہیں ("ہمیں حسن کے معیار بدلنا ہوں گے۔" پریم چند) لہٰذا نئی قدروں سے الہام یافتہ ادب، پرانی قدروں کے خلق کردہ ادب سے مختلف اور مشکل ہوگا۔ یہ ایک بہت گمراہ کن تصور ہے۔ ادب کی قدریں بدلتی نہیں۔ شعر کی جو تعریف سافکلیس کی نظر میں تھی وہی ہم لوگوں کی بھی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم سافکلیس کو سمجھنے سے قاصر رہتے اور ہر ادبی تخلیق ایک خاص مدت کے بعد مردہ ہو جاتی۔ اس سوال کا جواب ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے یوں دیا ہے:

> ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہماری تہذیب کی موجودہ شکل میں شعرا کا مشکل ہونا لازمی اور لابدی ہے۔ ہماری تہذیب بہت زیادہ تنوع اور پیچیدگی پر محیط ہے۔ اور یہ تنوع اور پیچیدگی جب کسی ذکی اور محلّی شعور پر اثر انداز ہوگی تو لامحالہ متنوع اور پیچیدہ نتائج پیدا کرے گی۔ اس لئے شاعر، زبان کو اپنے معنی میں بہ زور داخل کرنے، اور اگر ضرورت پڑے تو اسے اپنی جگہ سے اکھاڑ کر بہ زور داخل کرنے کی کوشش میں اور بھی زیادہ جامع، حوالوں سے بھرپور اور بلاواسطہ ہوتا جائے گا۔

لیکن یہ جواب بھی مکمل نہیں ہے۔ ایلیٹ نے عصری شاعری کے اشکال اور ابہام کی توجیہ صحیح کی ہے، لیکن یہی مشکل شاعری اپنے بعد آنے والی نسل کو (مثلاً خود ایلیٹ کی شاعری) کیوں اس درجہ قابل قبول اور مستحسن دکھائی دینے لگتی ہے؟ اس سوال کا جواب ایلیٹ کے یہاں نہیں ملتا۔ ڈے لوئس نے شعری پیکر کی بات کرتے ہوئے جب کہا تھا کہ "پیکر زندگی کے گہرے تناؤ کو توڑ دینے کا کام کرتے ہیں، تاکہ یہ تناؤ انفرادی دلوں کو بہ حفاظت حرارت پہونچانے اور منور کرنے کے کام آسکے" تو اس کی نگاہ اس حقیقت پر نہیں گئی تھی کہ اب

شعری پیکر انفرادی ذہنوں کو حرارت یا نور پہنچانے کے بجائے ایک چکا چوند کرنے والی روشنی سے اندھا کر دیتا ہے۔ دا توک ویل de Tocqueville نے اس سلسلے میں پیش گوئی کی تھی کہ

> مجھے اس بات کا خوف نہیں ہے کہ جمہوری سماج کی شاعری بے مزہ اور بے روح ثابت ہوگی۔ یا بہت بلند پرواز نہ ہوگی۔ بلکہ مجھے تو یہ خوف ہے کہ یہ شاعری ہمیشہ خود کو بادلوں میں گم کرتی رہے گی ... مجھے خوف ہے کہ جمہوری [دور کے] شعرا کی شاعری بھاری اور غیر مربوط پیکروں سے مملو ہوگی...

یہ خیالات اپنی جگہ پر صحیح ہیں اور ہمارے عہد کی شاعری کی صحیح تشخیص کرتے ہیں، لیکن "آج کی مشکل شاعری کل آسان ہوگی، اور آج کی شاعری اس لئے مشکل ہے کہ وہ بھاری اور غیر مربوط پیکروں کے ساتھ بادلوں میں اڑتی پھرتی ہے" کہہ کر ہم اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے۔

دراصل اس سوال کا حل اسی بنیادی نکتہ میں مضمر ہے جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ شاعری وہ آسان ہوتی ہے جو عام زبان سے نزدیک تر ہو۔ آج کے مقابلہ میں کل کی شاعری عام زبان سے اور زیادہ دور ہوگی، اس لئے گذشتہ دن کی شاعری کی زبان، عام زبان سے نسبتۃً نزدیک تر نظر آئے گی، اس لئے وہ آسان معلوم ہوگی۔ جس طرح پیارے صاحب رشید کے لئے اقبال کا کلام ناقابل فہم تھا لیکن انیس کا نہیں، اسی طرح آج کے ترقی پسند نقادوں کے لئے نئے شاعروں کا کلام ناقابل فہم ہے، لیکن اقبال کا نہیں۔ اس سلسلے میں آڈن کی شاعری کے بارے میں اس کے استاد نے ایک دل چسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب آڈن نے اسے اپنی نظمیں سنائیں تو اس نے ان میں ایک عجیب قوت کا احساس کیا، اور کہیں کہیں کوئی کوئی پیکر انوکھی شدت کے ساتھ منور نظر آئے، لیکن مجموعی حیثیت سے نظمیں اس کے لئے بالکل ناقابل فہم نکلیں۔ آڈن نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ ایلیٹ کی نظمیں پڑھے! نکتہ یہ ہے کہ ایلیٹ کے ہم عمر استاد کے لئے آڈن اور ایلیٹ بند کتاب کے مانند تھے لیکن ایلیٹ سے کم عمر شاعر آڈن (جو ایلیٹ سے ۱۹ سال چھوٹا ہے) کو ایلیٹ کا کلام سمجھنے میں کوئی خاص دشواری نہ ہوئی!

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ مشکل یا آسان، ہر طرح کی شاعری کو سمجھنے کے لئے قاری کا ذہنی مدیہ وہی ہونا چاہئے جو شاعر کا تھا۔ اس بنیادی حقیقت کی طرف سب سے پہلے کولرج

نے توجہ دلائی تھی۔ کولرج اور جانسن میں فرق یہ تھا کہ جانسن کسی بنے بنائے معیار کے مطابق
شعر خلق کرنے کا متقاضی تھا۔ اس شعر کی واقعیت، سچائی، ہیئت، جدت فکر، صداقت احساس
وغیرہ پر الگ الگ بحث ہو سکتی تھی۔ کولرج ان اجزا، کو الگ الگ کرکے دیکھنے کا قائل نہ
تھا۔ چوں کہ شعر تخیلی قوت کی تخلیق تھا، اور تخیلی قوت اشیا مختلفہ میں وحدت ڈھونڈ کر انھیں
صورت بخشتی تھی، اس لیے قاری کے لیے شعر کا مطالعہ اسی وقت کارگر ہو سکتا تھا جب
وہ خود بھی اپنی تخیلی قوت کو اس طرح آزاد چھوڑ دے اور اپنے شعور کو اس طرح اور اس
حد تک تعلیم دے کہ تجربہ و احساس کے سامنے اس کے بھی جذباتی جوابات emotional
responses وہی ہوں جو شاعر کے تھے۔ پہلے سے مفروضہ اصول و قوانین کی روشنی میں
ادب کو جانچنے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس نے ۱۸۱۸ میں کہا:

> یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ افراد کیا، بلکہ اقوام اپنی تعلیم اور
> ماحول کے اس درجہ غلام ہیں کہ شعر و ادب پر بھی ان کا محاکمہ غیر
> جانب دارانہ نہیں ہوتا۔۔۔ [انھیں] ہر وہ چیز غیر عقلی، غیر مناسب اور
> بدصورت نظر آتی ہے جو ان کی اپنی تعلیم و تربیت سے مطابقت نہیں
> رکھتی۔۔۔ لیکن نقاد، سچا نقاد اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ خود کو کسی
> مرکزی نقطہ پر متعین کرکے [ادب کی] پوری وسعت کو دیکھ سکے، یعنی ایسے
> عام اصول وضع کرے، جن کی بنیاد عقل و شعور پر ہو۔

اس کے مقابلے میں ۱۸۰۲ کے اڈن برا ریویو کا یہ جملہ ملاحظہ ہو:

> شعر کے معیاروں کی تشکیل عہد قدیم کے کچھ الہام یافتہ معتقدوں
> کے ہاتھوں ہو چکی ہے۔ اب ان اصول و قوانین کی صحت میں شبہ
> کرنا جائز نہیں۔

نئی شاعری کی تنقید کے سلسلے میں کولرج کے اس اصول کا اعادہ کرنے کی ضرورت اور
زیادہ ہے، کیوں کہ نئی شاعری میں وہ عنصر بہت کم ہے جسے ہاپکنز Hopkins
نے شعر کا "عام قابل تعلیم عنصر"[۵۳] کہا تھا اور جس سے اس نے علم بیان، صنائع بدائع اور
لفاظی Rhetoric کے عناصر مراد لیے تھے۔ صنائع بدائع اور لفاظی شاعری کے

---
۵۳ the common teachable element

اہم جزو ہیں۔ لیکن زبان کے ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں شعر کی سطح پہ نہ رہ کر زہنی ہونے کا رجحان تیز تر ہونے لگتا ہے۔ نئی شاعری کے ظاہری اشکال کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی "شعریت" سامنے کی چیز نہیں ہے۔ ایک طرح سے یہ خصوصیت اسے عام بول چال کی زبان کے قریب بھی لے جاتی ہے کیوں کہ عام بول چال بھی ان دماغی قلابازیوں کا سہارا لینے سے انکار کرتی ہے۔ صنائع بدائع کو سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے شاعرانہ مزاج کی ضرورت نہیں، یا اگر ہے بھی تو ایک کم تر درجے کے شاعرانہ مزاج کی، جس کا اکتساب کیا جا سکتا ہے۔ صنائع بدائع کی تعلیم ہو سکتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کا حسن سمجھنے کے لیے تعلیم کافی ہے، کولرج کے تخیلی مزاج کی انھیں کم کم ہی ضرورت ہے ؎

گل چیں کا جواب تیا ملا ہے ۔۔۔ یوں شاخ قلم سے گل کھلا ہے

....

پاتے ہی پتا خوشی سے پھولی ۔۔۔ خاد ایسی ہوئی کہ رنج بھولی

پوچھا کہ سبب، کہا کہ قسمت ۔۔۔ پوچھا کہ طلب، کہا قناعت (گلزار نسیم)

... پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن ۔۔۔ مقدور کیا کہ ٹھہر سکے دم بھر آسماں (قصیدہ: ذوق)

... اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی ۔۔۔ جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی (جوش)

لیکن اس زبان کا حسن سمجھنے اور اس کا لطف لینے کے لیے تعلیم کافی نہیں :

> آج کل کے لوگ پڑھتے بھی ہیں تو اس طرح مضمون سے عبور کر جاتے ہیں گویا بکریاں ہیں کہ باغ میں گھس گئی ہیں، جہاں منہ پڑ گیا ایک بکٹا بھر لیا باقی کچھ خبر نہیں۔ ہوس کا چرواہا ان کی گردن پر سوار ہے، وہ دبائے لیے جاتا ہے۔ یعنی امتحان پاس کر کے ایک سند لو اور کوئی نوکری لے کر بیٹھ رہو۔ افسوس یہ ہے کہ نوکری بھی نصیب نہیں۔
>
> (محمد حسین آزاد: آب حیات)

یہ عام بول چال کی زبان ہے، لیکن ادبی بھی ہے، اور اس کا حسن زیر زمیں ہے، اس میں کوئی چیز قابل تعلیم teachable نہیں۔ یہ سچ کے دیہاتی آرٹسانوں کی زبان کی طرح خوش پودار لعد ٹھوس زبان ہے۔ نئی شاعری میں عوامی زبان کی خوش بو نہیں ہے، لیکن یہ قابل تعلیم بھی نہیں ہے، کیوں کہ حسن کے ظاہری وسائل سے منہ موڑ کر ان بسیار شیوہ ہا کو استعمال کرتی ہے جن کے نام نہیں ہیں۔

ان بسیار بے نام شیوہ ہا کا ذکر کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ نئی شاعری کی تنقید ممکن
نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ نئی شاعری کی تنقید اس قیمتی اور فارمولا زبان میں نہیں ہو سکتی
جو تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ ہر شاعر پر چسپاں ہو سکتی ہو۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اگر تنقید
صرف عیب نکالنے کے لئے کی جائے تو زیادہ آسان ہو جاتی ہے، کیوں کہ اس میں ان
بے نام خوبیوں کو نہیں پکڑنا پڑتا جو شعر کو واقعی شعر بناتی ہیں۔ تنقید و تنقیص کے سلسلے میں
کولرج نے ایک بات بڑی اچھی کہی ہے:

> جو شخص مجھ سے یہ کہتا ہے کہ کسی نئی تحریر میں نقائص اور عیوب ہیں تو وہ
> کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو اس کے بتائے بغیر مجھے نہ معلوم ہوتی۔ لیکن
> وہ شخص جو کسی [نئی] طبع زاد تحریر کے محاسن بیان کرتا ہے، یقیناً
> مجھے کارآمد اور دلچسپ اطلاع فراہم کر دیتا ہے...

لہٰذا یہ تو سمجھ ہی لینا چاہئے کہ نئی شاعری میں عیوب ہیں۔ اگر غالب اور میر کے یہاں ہیں تو
نئی شاعری میں بھی کیوں نہ ہوں گے؟ یہ سوال بھی بالکل فضول ہے کہ نئی شاعری نے
اب تک کوئی غالب یا میر یا اقبال کیوں نہیں پیدا کیا؟ پرانی شاعری ہی نے کتنے غالب
کتنے میر اور کتنے درد پیدا کئے؟ ترقی پسند تحریک نے کس اقبال قامت شاعر کو جنم دیا؟
چھٹی صدی عیسوی کے بعد کوئی پیغمبر نہیں پیدا ہوا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ باقی چودہ
صدیاں بالکل ناقابل اعتنا ہیں؟ ہمارے عہد میں بڑی شاعری کے امکانات بہرحال
بہت کم ہیں، اور کسی بھی عہد میں ایک ہی دو واقعی بڑا شاعر جنم لیتا ہے۔ بہرحال یہ سوال
ہمارے آپ کے طے کرنے کا نہیں ہے۔ غالب کے شاگردوں کے علاوہ اور کسے یقین تھا
کہ وہ مومن اور ذوق سے بڑے شاعر ہیں؟ اور غالب کے شاگردوں کے بھی دل میں کہیں
نہ کہیں کوئی چور چھپا ہوا رہا ہوگا کہ شاید مومن خاں زیادہ اچھا کہتے ہیں۔

نئی شاعری کی تنقید شروع کرنے کے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنا اچھا ہوگا کہ
"نئی شاعری" سے مراد کیا ہے؟ یہ بات فوراً مان لینے کی ہے کہ جس طرح شاعری کی جامع
اور مکمل تعریف نہیں ہو سکتی اسی طرح نئی شاعری کی مکمل تعریف کرنے کی کوشش کرنا تحصیل
حاصل ہے۔ دونوں صورتوں میں وجہ ایک ہی ہے: شاعری کوئی مجرد، مطلق، آزاد اور اپنی
جگہ پر مکمل چیز نہیں ہے۔ نثر، شاعری، لفاظی، ڈرامائی انداز، استعارہ، پیکر یہ سب

اس طرح سے جلے ہیں کہ ان کو الگ الگ کر کے دیکھنا بڑی غلطی کا موجب ہوگا۔ آرتھر کوئلر کوچ نے ایک بڑی اچھی مثال سے اس کو واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: میں کسی علاقہ (مثلاً کنٹ Kent) سے کسی اور علاقے (مثلاً مڈل سکس Middlesex) کی طرف سفر کرتا ہوں۔ آہستہ آہستہ کنٹ کے نباتات وحیوانات وجمادات کم ہونے لگتے ہیں اور مڈل سکس کا لینڈ اسکیپ آنے لگتا ہے۔ میں سرحد پار کر کے کنٹ سے مڈل سکس میں داخل ہو جاتا ہوں، لیکن مجھے کوئی بین فرق محسوس نہیں ہوتا، اس لئے میں یہ نہیں سمجھ پاتا کہ میں ایک علاقے سے دوسرے علاقہ میں داخل ہو گیا ہوں۔ لیکن اچانک مجھے کوئی ایسی چیز (درخت، پودا، پھول) نظر آتی ہے جو کنٹ میں نہیں ملتی، اور میں سمجھ لیتا ہوں کہ میں مڈل سکس پہنچ گیا۔ ویسی ہی کچھ کیفیت نثر اور نظم کی ہے۔ اکثر نثر اور نظم آپس میں اس طرح سے جلے یا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں کہ ان کے مابین امتیاز مشکل ہو جاتا ہے، جب تک کہ کوئی واضح نشان سامنے نہ آئے۔ میرے خیال میں یہ واضح نشان، زبان کا استعمال ہو سکتا ہے کیوں کہ شعر اور نثر کی زبان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ فرق بہت واضح نہیں ہے مثال کے طور پر Synge (جس کا میں نے اوپر ذکر کیا) کے ڈرامے نثر میں ہیں، لیکن ان کی زبان شعر کی زبان کی طرح جھل ملاتی ہوئی اور موسیقیت سے بھرپور ہے۔

بہرحال، اگر نئی شاعری کے عناصر اربعہ گنائے جائیں تو نئی اور پرانی شاعری میں زیادہ فرق نظر نہ آئے گا، کیوں کہ ہیں دونوں شاعری ہی۔ کچھ ایسے بنیادی لہجے اور موضوعات ضرور ڈھونڈ نکالے جا سکتے ہیں جو نئی شاعری نے ہمیں دیے ہیں، مگر یہی بات ہر دور کی شاعری کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اصل میں بنیادی حیثیت سے نئی اور پرانی شاعری کا فرق رویہ attitude کا فرق ہے۔

اس بدلے ہوئے رویہ کا اظہار شعر کی زبان، موضوع، قاری کے متعلق شاعر کا انداز فکر و گفتگو، شعر کا مقصد یعنی شعریات کی داخلی مشینیت Internal mechanics کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے۔ اگر ان تمام پہلوؤں کو اکٹھا کر کے دیکھا جائے تو سب سے پہلے ہمیں مشرقی اصول شاعری کے ایک بنیادی نظریہ پر ضرب پڑتی نظر آتی ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری"۔ اگرچہ اس کلیہ میں پیغمبر کی طرح شاعر کے ملہم اور عالی دماغ ہونے کا تصور پنہاں ہے لیکن بنیادی نکتہ یہ ہے کہ پیغمبر عمل اور خاص کر طبیعی عمل physical action کی تلقین کرتا ہے۔

مشرقی شعرا نے چاہے طبیعی عمل کی تلقین بہت زیادہ نہ کی ہو (اور حقیقت یہ ہے کہ بہت کم کی) لیکن اس کلیہ سے مفر اور انکار کی جرأت کسی کو نہ ہوئی۔ ترقی پسند تحریک نے اردو میں جس تیزی سے جڑ پکڑی اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اردو شاعری کی روایت اور ترقی پسند تحریک کے بنیادی اصول دونوں میں ماٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کا نظریہ جاری و ساری تھا۔ نئی شاعری چوں کہ شعر کو ایک ذاتی عمل مانتی ہے اس لئے طبیعی عمل کی تلقین کی نفی کرتی ہے۔ آج اردو میں نئی شاعری کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ شاعری مشکل ہے یا الٹی سیدھی معلوم ہوتی ہے، بلکہ مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ شاعری کوئی پیغام عمل دینے کا دعویٰ نہیں کرتی۔ پیغام عمل دیا تو غالب و میر اور انیس و آتش نے بھی نہیں تھا، لیکن وہ اپنی شاعری کو نوائے سروش کہہ کر اسے کسی نہ کسی طرح پیغمبری کی سرحدوں کے اندر لے ہی آتے تھے۔ مذاق عام، رسوم کے روایتی احترام اور روایتی ثقہ پن کا جس درجہ اور جس طرح اسیر ہے وہ ہم سب پر واضح ہے۔ مغرب میں ڈھائی ہزار برس سے مصوری اور سنگ تراش عریاں عورتوں کی شبیہ بناتے رہے تھے اور کسی کو کبھی ان تصویروں میں کوئی مخرب اخلاق یا فحش بات نہیں دکھائی دی تھی۔ لیکن جب ڈی۔ ایچ لارنس نے اپنی عریاں عورتوں کے موئے زہار بھی دکھانے شروع کر دئے تو ہر طرف ایک غلغلہ مچ گیا اور اسے وہ تصویریں نمائش گاہ سے اٹھا لینی پڑیں۔ اسی طرح اگرچہ اقبال کے علاوہ اردو کے کسی بڑے شاعر نے شاعری کو تعلیم و تلقین کا ذریعہ نہیں سمجھا اور نہ شاعری کو اس طرح برتا لیکن ان پر کوئی اعتراض وارد نہ ہوا کیوں کہ انھوں نے شاعری کی مقصدیت کی باقاعدہ تردید کبھی نہیں کی تھی۔ نئی شاعری کے علم بردار عملاً وہی کر رہے ہیں جو شاعری میں ہوتا آیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے قول اور فعل میں وہ تضاد نہیں ہے جو میر و غالب کے یہاں تھا۔

رویہ کی اس کھلی تبدیلی نے نئی شاعری سے وہ چیز چھین لی ہے جسے نظریہ کہتے ہیں۔ اگر غالب کے یہاں نظریہ نہیں تھا تو کھینچ تان کر بنا لیا گیا، اگر درد کے یہاں کوئی نظام فکر نہیں تھا تو تاویلیں کر کر کے ان کو صوفی شاعر بنا دیا گیا، کیوں کہ فلسفہ اور نظریہ کے بغیر شاعر پیغمبر کیوں کر ہو سکتا ہے؟ نئی شاعری چوں کہ نظریہ کی شعری اہمیت سے انکار کرتی ہے (اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شاعر زندگی کے متعلق کوئی نظریہ رکھتا ہی نہیں، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ شعر کو نظریہ کا پابند نہیں سمجھتا) اس لئے نئی شاعری میں بہ ظاہر ایک انتشار

اور اختلال نظر آتا ہے۔ میں نے "بہ ظاہر" اس لئے کہا ہے کہ شاعری ایک انتہائی منظم عمل ہے جس کا نتیجہ ایک بہت ہی جچی جانی compact چیز کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ سطح کا یہ انتشار صرف اس وجہ سے ہے کہ شاعر اپنی شخصیت کو بار بار اپنے ماحول سے متصادم پاتا ہے اور پھر بہ قول ایلیٹ وہ اپنی زبان کو اپنے معنی میں "بہ زور، اور اگر ضروری ہوا تو اسے اکھاڑ کر" داخل کرنا چاہتا ہے۔

نئی شاعری دل سے زیادہ ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ ایسا اس وجہ سے نہیں ہے کہ دل کو متاثر کرنا مشکل ہے؛ بلکہ اس وجہ سے کہ نئی شاعری جذبات کے الجھاووں کو ٹھوس زبان میں ظاہر کرنا چاہتی ہے اور مجرد جذبات کے اظہار سے گریز کرتی ہے۔ جذباتیت سے گریز، شاعری کے داخلی سفر کی ایک اور منزل ہے۔ نیا شاعر قاری کو روایتی طریقے سے متاثر نہیں کرتا (جذباتیت) نہ اسے مرعوب کرتا ہے (لفاظی) نہ اسے متحیر کرتا ہے (مابعد الطبیعاتی بلند پروازی)۔ نئی شاعری کا عمل اضطراب انگیزی کا عمل ہے۔ اضطراب انگیزی کے اس عمل میں وہ زبان کی روایتی "لطافت" اور "شیرینی" کو نظر انداز کر کے ارادی طور پر ایک درشت اور بے چین اسلوب اختیار کرتا ہے۔

لیکن درشتگی اور بے چینی تمام نئی شاعری کا امتیاز نہیں۔ کہیں کہیں درشتگی کے بجائے تحت لہجہ کا تاثر ملتا ہے، لیکن درشت لب و لہجہ ہو (عمیق حنفی، احمد ہمیش، عادل منصوری) یا دھیما اور بہ ظاہر "شاعرانہ" انداز (براج کومل، شہریار، قاضی سلیم) تمام نئی شاعری میں ترددanxiety اور غیر محفوظیت insecurity کی قدر مشترک ہے۔ قاری کی طرف نئی شاعری کا رویہ فدویانہ یا مولویانہ نہیں ہے۔ چوں کہ نئی شاعری مضطرب کرنے اور جھنجھوڑنے کا عمل کرتی ہے اس لئے اس کا لب و لہجہ پختہ اور اعلیٰ اسلوب کی نفی کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل مثالیں دیکھئے:

جذباتی تاثر: (میر)

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے	جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند	یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
فقیرانہ آئے صدا کر چلے	میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
ہم فقیروں سے کج ادائی کیا	آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

لفاظی اور مرعوب کرنے کے تیور (اقبال)

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

مابعد الطبیعاتی بلند پروازی اور اس کے ذریعہ تحیر (غالب)

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہ آفتاب
ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

ان مثالوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میر، اقبال اور غالب کے یہاں ہر شعر اسی طرح کا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان شعرا اور اردو کے تمام مانے ہوئے شعرا کا رویہ اپنے قاری کو مرعوب کرنے، متحیر کرنے یا متحرک کرنے کا رہا ہے۔ میرا جی اور ان کی قبیل کے دوسرے شعرا نے اردو میں پہلی بار اس بات کا احساس کیا کہ شاعری سلجھانے کے علاوہ الجھانے، متحرک کرنے کے علاوہ سکتے میں ڈال دینے، تسلی اور سکون بخشنے کے علاوہ مضطرب کرنے کے بھی کام آسکتی ہے۔ نئی شاعری میں یہ احساس ایک مستقل رجحان کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اونچا اور چمکتا ہوا روایتی انداز ہماری زندگی سے کہیں میل نہیں کھاتا۔ نئی شاعری میں حل نہ ہونے والی پیچیدگیوں اور چونکا دینے والی ذہنی الجھنوں کا جو تصور ملتا ہے، اسے روایتی چونکا دینے والے استعارے یا اسلوب سے ممتاز رکھنا چاہئے کیوں کہ روایتی شاعر دور از کار تشبیہ یا انوکھا استعارہ اس لئے استعمال کرتا تھا کہ اسے نزاکت اور جدت خیال کی داد ملے، نئی شاعری جدت خیال کی اس درجہ قائل نہیں ہے، جتنی صداقت خیال کی۔ نئی شاعری کے بارے میں یہ الزام درست نہیں ہے کہ اس میں لہجہ کا تنوع نظر نہیں آتا۔ لیکن یہ ضرور صحیح ہے کہ تمام نئی شاعری میں ایک ہی فضا ملتی ہے جسے میں بے چینی اور تردد کی فضا کہتا ہوں۔ میر کے محولہ بالا اشعار میں درد کا آہنگ تو ہے لیکن اس آہنگ میں ایک بھاری ٹھہراؤ ہے جو دل کھول کر رو لینے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ نئی شاعری اس طرح کے درد سے عاری ہے، لیکن درد کے فقدان ہی نے اسے ایک متلاطم اور مضطرب کیفیت بخش دی ہے۔

غالب کے اشعار پھر سے پڑھئے۔ اردو کے تمام بڑے شاعروں میں غالب سے زیادہ

ذاتی اور کائناتی المیہ کا احساس کسی کو نہ تھا۔ اور بیسویں صدی کے ذہن کی جیسی پیش آمد anticipation غالب کے یہاں ہے، ویسی بیسویں صدی کے بھی بہت سے شعرا کو نصیب نہ ہوئی۔ لیکن اس فریب شکستگی کے باوجود ان کے لہجے میں ایک (غالباً نقلی) اکڑ اور لاپروائی ہے۔ برق سے شمع ماتم خانہ روشن کرنے کا تجربہ نئے شاعروں کو بھی ہوا ہے، لیکن وہ خود کو "آزاد" اور "بیش از یک نفس" غم کرنے والا تصور نہیں کرسکتے۔
غالب کا ذہنی تجسس intellectual curiosity ان میں اپنے علاوہ دوسروں کے بھی دلوں کے نہاں خانوں کو کریدنے پر اکساتا ہے۔ ان کے لئے محبوب کی شخصیت اب بھی اتنی دل آویز ہے کہ اس کے دیدار کے لئے سورج اپنی آنکھیں اس کے روزن دیوار پہ جمائے رکھے اور پھر کسی ساحرانہ تبادلہ کے ذریعے اپنی نگاہ کے ذرے روزن میں چھوڑ جائے۔
اس طرح غالب کا تجسس انھیں دل بہلانے کے سامان مہیا کردیتا ہے۔ وہ اس بات کا غم نہیں کرتے کہ روزن دیوار پر ان کی آنکھ کیوں نہیں جمی ہوئی ہے تاکہ وہ محبوب کا دیدار کرسکیں۔ وہ اسی پر خوش ہیں کہ خود مہر نیز ان کے محبوب کا دل دادہ ہے۔
فریب شکستگی میں دل خوش کرنے کے یہ انداز نئی شاعری کو نصیب نہیں۔ غالباً نیا شاعر غالب سے زیادہ واقعیت پرست ہے، یا شاید وہ غالب سے کم تر درجہ کا دل و دماغ رکھتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ درشتگی، اضطراب، غیر محفوظیت کا احساس، فریب شکستگی، افق سے افق تک چھائی ہوئی تشویش و تردد کی فضا اور روز بہ روز عام محاورہ سے دور جاتی ہوئی، زیادہ داخلی ہوتی ہوئی اور زیادہ غیر رسمی ہوتی ہوئی طنز اور تڑپ اور چبھن سے بھرپور زبان، یہ نئی شاعری کے بنیادی علائم ہیں۔

حامد حسین حامد

کچھ اصول انتخاب کے بارے میں

تقسیم ہند کے بعد ابھرنے والے شاعروں کی نسل جس نے فرقہ وارانہ فسادات، لسانی عصبیت اور مذہبی تنگ نظری کے بدترین مظاہرے، اقدار کی پامالی اور اجتماعی آدرشوں کی شکست و ریخت اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اس کی شاعری، تقسیم ہند سے پہلے کی اجتماعی تصورات، خوابوں اور تحریکوں کی فضا میں پروان چڑھنے والی شاعری سے اسی طرح مختلف ہے جس طرح موخرالذکر خود اپنی پیش رو سے۔ آج کا شاعر کسی خوش آیند مستقبل پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ تشکیک اور انتشار سے دوچار ہے اور تن تنہا بدلتے ہوئے حالات کے بھنور میں پھنسی ہوئی انفرادیت کی کشتی کو بچانے کے لئے مصروف عمل ہے۔ اس کے تمام تر روحانی اور مادی سہارے یکے بعد دیگرے جواب دیتے جا رہے ہیں۔ اس کے تجربات اور مسائل اس کے بزرگوں کے تجربات اور مسائل سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس کے بزرگوں کو اس کی بات اور اس کے لہجے کو سمجھنے میں تکلف ہے اس لئے داخلی جھلاہٹ کے تاثرات کے ساتھ خود سے مصروف کلام ہوتے ہوئے بھی اپنے فن اور شخصیت کی حقیقت کو منوانے کے لئے مصر ہے "نئے نام" کے مشمولات ایسی ہی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

"نئے نام" میں ہندوستان کے ہر اس اردو شاعر کا منتخب کلام شامل ہے جس کو ۱۹۶۰ کے بعد جانا پہچانا گیا ہے یا جاننے پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے اور جس کا لب و لہجہ اور سوچنے سمجھنے کا انداز نیا ہے۔ "نئے نام" کی رعایت سے نو واردان بساط شاعری کی نمائندگی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ پاکستان میں چوں کہ جدید شاعری کی تاریخ زیادہ پرانی اور بسیط ہے اس لئے وہاں کے شعراء کے کلام کا علیحدہ انتخاب ضروری ہے جس پر ہم غور کر رہے ہیں۔

موجودہ انتخاب میں مختلف نظریات و اسالیب کے حامل صرف تین نمائندہ پاکستانی شاعروں، وزیر آغا، شہزاد احمد اور افتخار جالب کا کلام شامل ہے۔ اس سے ہمارا مقصد جدید شاعروں سے زیادہ جدید شاعری کی نمائندگی ہے۔ ورنہ ناصر شہزاد، عرش صدیقی انیس ناگی، عباس اطہر، ظفر اقبال، جیلانی کامران، سلیم احمد، محمود شام، شاد امرت سری، شکیب جلالی، نذیر احمد ناجی، اقبال منہاس اور دوسرے شعراء کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس انتخاب میں ایسے شعراء کا کلام نہیں شامل کیا گیا جن کا کلام بڑی حد تک جدید مزاج کا آئینہ دار ہے لیکن جن کے ادبی مقام اور منزلت کی دھاک حلقۂ ادب میں ۱۹۶۱ء سے پہلے بیٹھ چکی تھی ان میں خلیل الرحمن اعظمی، مختار صدیقی، اختر الایمان، مجید امجد، منیر نیازی، عزیز حامد مدنی، اور عارف عبدالمتین کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

"نئے نام" میں شامل تمام تر کلام شعراء سے براہ راست حاصل شدہ نمائندہ تخلیقات، مجموعہ کلام اور ہندوپاک کے رسائل میں شائع شدہ تخلیقات سے کئی نشستوں میں منتخب کیا گیا ہے۔ اس میں وہی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جن کی شمولیت پر راقم الحروف اور شمس الرحمن فاروقی کو مکمل اتفاق ہے۔ ایسی کوئی تخلیق "نئے نام" میں شامل نہیں کی گئی جس کے سلسلہ میں اختلاف کی گنجائش تھی۔

آخر میں یہ بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ کسی شاعر کی ایک، دو، تین یا اس سے زیادہ تخلیقات کا انتخاب کسی درجہ بندی کے پیش نظر نہیں کیا گیا بلکہ ایسا جدید شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور اسے سمجھنے سمجھانے کے لئے کیا گیا ہے۔

بہ رنگِ سبزہ عزیزانِ بدزباں یک دست
ہزار تیغ بہ زہراب دادہ رکھتے ہیں

معاف بیہدہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز
دلِ بہ دستِ نگارے نہ دادہ رکھتے ہیں

غالب

ابرار اعظمی

کل شب کے اجالے میں کوئی دیو کھڑا تھا
یا میرا ہی سایہ قد آدم سے بڑا تھا
اب کوئی غم عشق کے مارے نہیں مرتا
بازار میں دیوانہ کوئی بیچ رہا تھا
ساقی نے تو چاہا تھا نگاہوں سے پلانا
پر جام تھا خالی مرا، میں سوچ رہا تھا
ایمان کی پوچھو تو ہے سب پیٹ کی خاطر
واعظ نے پس وعظ یہ خود مجھ سے کہا تھا
شیطان کے ڈرانے کے لئے گرز نہ تھا، وہ
راکٹ تھا ـــــ خلاؤں کا جگر چیر رہا تھا

جاڑے کی ایک رات

بجلی کے کھمبے ٹھٹھرے ہیں
سردی سے کانپتے لمحوں نے
جاڑے میں سکڑتی گھڑیوں نے
کہرے کی چادر اوڑھی ہے
کتے سڑکوں پہ جگہ جگہ
سانسوں کے گرم الاؤ میں
یہ سوچ کے تاپ رہے ہیں
کہ
چوپال میں کل اس رت کا
جب ذکر چلے گا تو ان کا بھی
اس قصے میں نام آئے گا

احمد ہمیش

تجدید ملا

مصیبت یہ ہے کہ شروع ہی میں اس فاؤنٹین پن کی نب میں ایک خلا آگئی ہے کیوں کہ
ہمارے ملک میں
کبھی ایک سیاہی اور بہتی نہیں
لکھتے ہی اس میں دھول چپک جاتی ہے
تو بہرحال جہاں سے ہم کبھی قرض کرنے گئے ہوں گے
وہیں کہ شعلوں عمروں اور عادتوں کی آنکھیں بناتی ہوئی
روشنی ایستادہ تھی
عادتیں اور عمریں، ہمارے ملک کے پالے غلاموں کی طرح
اپنا اپنا حصہ لینے کو کھڑی تھیں
یعنی ہم نہیں جانتے کہ ہم کیوں روشنی میں بٹ گئے
یعنی ہم نہیں جانتے کہ ہم کیوں اندھیروں میں ملول بنے
اس وقت جب ہم سفر میں، رات ہوتے ہیں
تو ایک ان دیکھی بچی کا چہرہ گونج جاتا ہے
یہ ہمارا قصہ ہے ــــ ہمارے پاؤں کہیں لانبے شہروں میں چل رہے ہیں
تو ان کے چلنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اب
جی دار زلزلے نہیں آتے

ہمارا ملک تو غذائی نخوستوں کا ویت نام ہے
اور اتنا ہی کافی ہے
وہ کیسے بستر ہیں، جن پر کبھی عورتیں نہیں سوئیں
جن کی تربیت، محض ایک کھونٹی ہے
جن پر دماغ اور جسم سبھی ٹنگے ہیں
سمندر، اس ملک کی دھول پندار بھیڑ سے دور ہیں
بھلا سرخ گوشت کی نوک کہاں سے نکلتی ہے اور کہاں اثر
ہوتا ہے ــــــ پتہ نہیں

احمد ہمیش

تجدید نمبر ۲

۲ مارچ ۷۶ء
آج رات کے ٹھیک آٹھ بجے ایک آدمی اپنے ایوانی خاکداں میں صفر صفر گر رہا ہے یا
وہ ان تمام ناتمام ایوانوں میں بسر ہو رہا ہے'
جن میں ہم سب کو بسر ہونا ہے اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے
جب تم یہ آواز انگیز اعلان'
ماورائے بیدار بلندی سے سن رہے ہو
تو باخبر و دھیان
کہ یہ تمام پالتو حماقتوں کے سونے کا سمے ہوتا ہے
تو باخبر و دھیان
کہ ٹھیک اسی سمے' رہرِسل نژاد زمین کے تمام گروہوں کا
تمام نمائندہ حق تلفی' انا یا س ہی کسی دعوت مجہول کا اعلان
کیا کرتا ہے (یعنی وہ دعوت کرے گا)
بہت چالاک ہے بدبخت' مگر دھوئیں کی اولاد اکال
ائے یہ سب کیا تماشہ ہے؟ میں وہ تو نہیں ہوں' جو
بسر ہو رہا ہے
کہیں اس لفظ "ہے" سے بسر ہونے تک فاصلہ' زوال گنا ذلت تو نہیں
مگر ذلت کا کوئی "کا" نہیں ہوتا

نہیں موصوف، ہم انسانی نہیں ہیں — نہیں ہیں نہیں ہیں
صدیوں بار کہہ دیا بالکل نہیں ہیں
نہیں موصوف، تم حیرتی درندے ہو — اور یہ جو مفروضہ آب و خاک
ہے، وہ تمھارا ہی سہی
مگر نہ ہمارے سروں پہ کوئی گراف زدہ لکیر ڈولتی ہے اور نہ ہم
کوئی زادہ عبارت ہیں کہ بہت ہو چکا سلوک مدام
کہہ دیا نا کہ وہ سب گرانی عورتیں تھیں، جو ہمارا ایمان نہ کر پانے کے غم میں
سڑکیں بن گئیں
وہ مسائلی مرد تھے، جو ہمیں کاغذی دباؤں میں گھول رہے تھے مگر غلطی
سے قانون بن گئے
اور شرط تھی اتنی گرمی اور دور از کار کہ دھول بہت کافی تھی دنیا میں
اگر لوگ پانی نہ ملنے پر اکال کا رونا نہ روتے!
کیوں کہ دہرائی ہوئی روٹیاں کبھی ناپید نہیں ہوئیں کیوں کہ وہ باریک گوشت میں
اترتی چلی گئیں چلی گئیں چلی گئیں — لوگ کیوں نہیں کھاتے ان بے اولاد قطروں کو
جو ٹانگوں اور ہاتھوں کی حرکت خالی سے گرے — اور دھول میں ملتے گئے ملتے گئے
ملتے گئے

احمد ہمیش

تجدید ۔ ۳

تم ایک ہی لباس نہیں پہن سکتے
اور وہ ہے سفر
۲۷ سال سے اس عرصۂ بے زمیں پر، میں سفر ہی تو پہنتا آیا ہوں
ایک بار ایک قصبہ میں ایک ننھی سی بچی نے مجھ سے
مری اداسی پوچھی تھی
مری اداسی مرے اندر تھی
اور بچی کا مطلب باہر تھا
باہر کی قوت نے مری چھپی ہوئی روٹیاں چھین لیں
تم نے کہیں سے سن لیا کہ جو مٹی گرفت سے چپک جاتی ہے اس سے ایک اٹل مکان بنتا ہے
سو، تم اٹل مکان میں اٹل بن گئے
تم نے میری شہریت چھین لی
کیوں کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا، جنھوں نے مخلص عورتوں
کے نام سونگھنے میں کئی برس گنوا دیے — پھر شاید انھیں کوئی چور دروازہ
مل گیا
کچھ لوگ جو جیل سے چھوٹ کر آئے تھے، انھوں نے اپنے گھروں
کی سلاخوں کو نیلے رنگ سے رنگ لیا

احمد ہمیش

کیوں کہ نیلے رنگ کی نیند، آرام اور وہم کے درمیان شائد ایک ٹانک ہوتی ہے
میں نے کبھی ٹانک نہیں پیا
مرے پاس تو کچھ جمع کی ہوئی روٹیاں تھیں
انھیں میں کہیں کھانے بیٹھا تھا
کہ شہروں کے چوراہوں کی سمت جاتی دھوپ بہت تیز ہوگئی
ایک ملک کا دھواں دوسرے ملک کی فصلوں میں سرائت کرگیا
تم نہیں جانتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا
تم اپنے اٹل گھر میں اٹل رہے
میں آگے چل دیا
مجھے چور دروازہ بھی نہیں ملا

افتخار جالب

نفیس لامرکزیت اظہار

(قدیم بنجر)

نقیب گویائی حرف زن بالارادہ سبقت کہ شرف ذومعنی
آرتھوپیڈک اتحاد انضمام بےڈھب بجز کراہت عدم تشدد
کہ دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں؛ بر سرِ عام لعن طعن؛
اس کے منہ پہ تھوکو؛ نفیس فسق و فجور کی ڈالیوں نے
ہیبت سے چمٹے پتوں کا نرم تازہ کلوروفل اس طرح
نگلنا شروع کیا ہے؛ سفید میگنولیائی غنچے دھڑوں پہ
دہشت زدہ سراسیمہ بے ارادہ گڑے ہیں: دل کو مآل کم تر کا
پیپی روس روگ، گھن سرایت، برادہ
تجویز ہو رہی ہے، دبا دیا جائے
مزاج کی رونقیں نفاست وسیلے قانون صاف ستھرا رکھیں گے؛
بنجر قدیم ذرے گلو و گفتار میلے کرتے رہے ہیں؛ فٹ پاتھ
منضبط شہری زندگی کے علامئے کنکریٹ روشن
مبادا تعبیر چھینتے تند تنگ مبحث کا آرتھرائٹس فساد پٹھوں کی
اینٹھ تلخی دہن مزا کرکرا
قدامت پسند کابوس شیشہ در شیشہ
شیفتہ مدور سیاہ سورج کے دریا

افتخار جالب

گرد بادِ تکذیب میں اڈتا ہے
گا ہے چوراہے میں چکا چوند، مندمل زخم
خوف ناک گمبھیر چشم بد دور تیرہ محبس
حرام مغز امتحان میں ہے
شدید تھوڑیکیں درد، ہر جزو متصل، ٹوٹنے کے لگ بھگ؛
تراش اٹھتی ہے
کیا تنک ظرف شدہ الرجک جمع تعظیم دل پھپھولے؛ سفید
خاکستری پپوٹوں میں دم بہ خود دائمی شراروں کی آنکھ؛ آنگن
میں تنہا مرغی غنودگی کا شکار
تھائرائڈ غدود غفلت مآب ٹھیری ہے
برق رانوں میں رونق رم نہیں جاتی، نہ جبلی وش خون تھرتھراہٹ
خفیف مدھم نڈھال ناگفتہ بہ، جسے ابھی تک ہمارے لفظوں
میں بار پانے کی آرزو ہے، وہ سانس نتھنوں کے نیچے لتھڑے
دہکتے ہونٹوں کی کپکپاہٹ میں غرق ہوتا ہے
آج کی رات گرم آوارگی سے محروم
چپ! ہوا ہواؤں میں غوطہ زن ہے
ملال ذلت فشار ذریتوں کی شریانیں پھٹ رہی ہیں
قدم لئے ہیں؛ گماں مبریاد آوری خلیوں کے محدود تخلیے کا
جواز؛ انجام کار مضبوط انفعالی محاکمہ راستوں پہ محنت پسینہ

ٹیلکم، بکھرتا جاتا ہے۔ بے ارادہ فشودہ اعصاب کے تشابہ میں
شعبدہ روشنی کا مجلوق چہرہ چمکا، چمک رہا ہے۔ کیثف تعبیر
کی بصارت بساند رومال کے رگ و پے افق مذمت کنار تابندگی
کے ماتھے پہ سو رہا ہے؛ گداز گدلاہٹوں کی گم نام رونقیں
گرم گفتگو؛ صبر آشتی رلنے پسینے کو پونچھ ڈالو۔ یہ حشر برپا
رہے گا! ہم پہلی مرتبہ تو نہیں ملے ہیں
قیام سے انتقال معنی کا رزمیہ لکھتا خوں دھماکہ دم آفریں
دشت دشت ایجاب، امتداد زمانہ کیسی کھٹائی میں پڑ گیا؛
نشیب احتمال سرسبز شوق سے سرحدیں ملا کر عجیب عبرت سے
پانی مرتا ہے؛ خواب در خواب ٹیراان کو گ نیٹا چلتا ہے؛
دھند سنگینیاں اگلتی ہے

یہ نہیں، یہ نہیں
میں خود فریبی کی لذتیں چھوڑ دوں، نہیں
جاؤ، جاؤ، جاؤ

....

خروج دراز منہ جا خون جاں گسل لوتھڑا کہ سر صدور
بین السطور، وہ کچھ، وہی
قدامت عفریت آگ جلتی
ٹھٹھرتی چنگاریوں کے نازک بدن بدن شہر قرب اندیشہ

دراں حالے کہ شفقت مہیب بپتسمہ ہو چکا، لطف، لیسلا لطف
لامحالہ چھٹتا جائے
قبیح نامہرباں نقاہت: کسیلی، بے سمت، جاگتی، حجلۂ عروسی
میں ناگہاں شعلہ شب ردا نقشے ڈھب کڈھب، شب بخیرا!
اضطراب فی الواقع رنگ، ڈھلنے کے بعد جو بچ رہے
دہلی، تولئے میں لپٹی گداز رانوں کا آپ ہی آپ پھڑپھڑانا تڑپ
تڑپ ڈوبنا ابھرنا، خیال پانی کی محتسب مچھلیاں؛ دہائی سکتہ
شب خون، قطرے قطرے کا ٹوٹنا؛ لکس ٹائیلٹ سوپ رزم
آرا حواس آمد کے ہر قرینے سے دم بخود! زم گرم سناٹا چھا
گیا: قہرمان، جوالہ، تند خو تیرگی، مناسب کا بے سلیقہ
زوال آمادہ منتہا نقطہ

زہر فی الوقت زانیہ، لا ارادہ، خوددار، بھینی خوش بو کا جھونکا
خاموش نرگسیت کی گدلی پیلاہٹوں کو اوڑھے
گلی گلی تلملا رہا ہے

نہیں سمجھتا، یہ خود فریبی کے عنکبوتی چمکتے
جالے کو محض معکوس ناقص اندھی فنا کی یلغار کے مقابل کہ
ریلا تھمتا نہیں ہے، سطحوں کے نامکمل ہیولے چھوتے ہیں
شہر کے رگ و پے میں آمد و رفت رک گئی ہے
چہار جانب سکوت، پانی برس گیا۔ ساری چیزیں منہ ہاتھ

دھو چکی ہیں۔ نکھار آیا! جمال دوشیزگی در و بام دھوپ بے چارگی
میں سب کچھ خلط ملط؛ تازہ جگمگاتا، اداس، فرخندہ، ذہن
لاذہن، اجتنابی تعلق آلودگی

اسفنج پھیر کر لوح سے مٹا دیں
نئے سرے سے بشارت اندوہ ٹھن ٹھنائیں

جو بھولی بھٹکی سی بوند باقی تھی، گر رہی ہے
تمام جذبے جبلتیں جہد للبقا، سخت گیر تکرار ہو رہی ہے! مگر
مقاصد میں زخم تشویش ضعف
کسمساتا ہے؛ پتی پتی نفیس لا مرکزیت اظہار
ہوا میں اڑتی ہے
بہار کا خون سبز ناقص نفوذ جم تھم چکا ہے
سیاہ آفات کے مقطر منزہ معصوم خون تعمیر خاک سے ہاتھ
پاؤں فتنہ فساد دھو ڈالوں؟ جشن کا اہتمام دربار ایکلیزی آسٹک
تحیر بیان، پھولوں کو مسخ کر دو، رگوں پہ لکھا ہوا ہو؛ بہتی
غلیظ خون آگ چاٹتی ناچتی رہے؛ اضطراب تھرتھر دھکتے وقت
عذاب لمحات کو نہ جھنجھوڑ کر گذرتے ہیں
طواف توفیق مجتنب راستوں کی دھڑکن دوام دولابی باد، پاژندہ،
طشت درگشت؛ بھن بھناتی افسوس بے حسی گنجلک ندامت کے
ریشمی، انگلیوں سے از خود پھسلتے گچھے، بریدہ سر، امتناعی

افتخار جالب

تعزیر، دشت دروازے؛ باؤلی چیخ کند دانتوں کی کپکپاہٹ
میں آکے دم توڑتی ہے
کب تک سکوت سناٹا ناگہاں جبر

خوب، خوب

ممکن ہے

بے کراں دہر دھول خلوت کی چیرتی؛ زہر زندہ فعال ریشے ریشے
میں جذب متحیرانہ مستاجری جکڑبند، باتیں کھلتی نہیں ہیں؛
رستے بلا رہے ہیں؛ کلام کم یاب ناتراشیدہ شش جہت، آڑا ترچھا،

دو رویہ، مضطرب
مقابل کا چہرہ مہرہ کٹا پھٹا، مضمحل
خراشوں کی جھریاں منعکس بیانات میں جھلکتی ہیں
جب بھی چاہو؛ یہ دیکھو
ٹھیس خوردہ سفید شیشہ حکایت آشوب

ٹھیرو، چھیڑو نہیں، بکھر جائے گا
فی صدور عوام خرخراہٹ کبود پھیل وریدیں وسواس نسیم خوابیدگی
کی سنسان سائیں سائیں؛ مجرد ادبار رو بہ تشخیص؛ طرفہ سیماب نثر
مرجز گلاب تذکیر منتشر زاویے مخلط عذاب تانیث تنگنائے

افتخار جالب

جو موت پہچانے راستوں وصل یاب ہو جائے! غرق سڑکیں!
ادھورے امکان خواب خشتوں پر آدمی کا لہو چمکتا ہے۔ چند
لمحوں کی بات ہے: ایک گھونٹ پانی سے جلتے انگارہ ہونٹ،
معدودے چند بے اعتنا تکلف میں ضبط جملے، مذاقیہ زہر خند،
چوراہے میں اسی نے مباشرت کی ہے: سرخ، آسودہ شب لکیروں
کے حاشیئے میں عظیم چھینٹا! نہیں نہیں صاجو، محدب
مہیب عدسہ نگاہ مفتوح غیر حاضر حضور میں ہے
درندگی لا علاج دوشیزگی تناس
قریب تر ہے، قریب تر ہے

اکمل حیدرآبادی

صدیوں کی چھاپ

نصف صدی بیتی جب ہم نے سر جوڑے اک بات کہی تھی
ہم نے کہا تھا
"اب تک ہم نے جو لکھا ہے بے سوچے سمجھے لکھا ہے
شاہوں کی تعریفیں کی ہیں
حسن اور عشق کی باتیں کی ہیں
مندر، مسجد، مے خانے پر صرف کئے ہیں فکر کے سکے۔"
ہم نے کہا تھا
" روح ادب تعمیر جہاں ہے۔"
ہم نے کہا تھا
"آؤ کہ اب تعمیر کریں گے
اب نہ کریں گے زلف ولب ورخسار کی باتیں
ذکر صنم، دل دار کی باتیں۔"
نصف صدی کے بعد بھی لیکن پیش نظر عنوان وہی ہیں
ابروے جاناں، چشم غزالاں
جام و سبو اور سنبل و ریحاں

جانے کتنی دور روایت سایہ بن کر ساتھ چلے گی
جانے کتنی صدیوں ہم پر صدیوں کی یہ چھاپ رہے گی

باقر مہدی

ریت اور درد

مدتیں گذریں مرے دل کو ہوئے ویرانہ
آندھیاں بھی نہیں آتیں
کہ اڑے ریت، مٹے نقش سراب
اور اک درد کا چشمہ
مندمل زخموں سے پھوٹے نئی خنکی لے کر
پیاس جاگ اٹھے، سکوتِ دل مضطر ٹوٹے
تاکہ میں دیکھ سکوں!
اپنی بے خواب سی آنکھوں سے وہ منظر اک دن
ریت کے تودے فضاؤں میں اڑے جاتے ہیں
اور خوش ہو کے کہوں!
"زندگی ریت سہی، درد کا چشمہ بھی تو ہے"

باقر مہدی

آواز

پہلی چیخ سے لے کر اب تک
سانسوں کی لے
قدموں کی آہٹ سے آگے،
لمس کی گرمی،
پہلے گیت کا پہلا بول
پلکوں کی جنبش اور
دل کی دھڑکن روپ میں آکر
نیلے، پیلے، کالے رنگوں کی مبہم سی لکیریں بن جاتی ہیں!

لفظوں کی دیوار سے چھن کر
معنی کے رنگوں سے نکل کر
اک سرگوشی آتی ہے
جیسے اس سارے عالم کی
یوں تخلیق ہوئی تھی اک دن

باقر مہدی

ایک دوپہر

پنکھ ٹوٹا کوا نزیل کے پیڑ کے نیچے،
جانے کیوں چپ چپ بیٹھا ہے
تیز ہوا، ڈری ڈری خاموشی سے چلتی ہے،
اک اخبار سے منہ کو چھپائے اک بیٹنک اونگھ رہا ہے
دھوپ، پیڑ کے پاس تھکی لیٹی ہے
حبس ہے ایسا دل تک بے آواز دھڑکتا ہے
راجا بائی ٹاور کی بڑی گھڑی رکی پڑی ہے
رگ رگ میں ایک تھکن بے معنی سے درد کے ساتھ بہتی ہے

شاید ہم سب اس لمحے کو ڈھونڈ رہے ہیں
جس کے آتے ہی، برق سی ہر شے میں دوڑے گی
لیکن آج تو وہ لمحہ — افسردہ، زخموں سے نڈھال
سوکھی گھاس پہ سوتا ہے۔

بشر نواز

سچ کی قیمت

ہمالیہ کی بلند چوٹی پہ میں کھڑا ہوں
اگر میں تم سے کہوں یہاں میں نے سات رنگوں کے راز پائے
ہوا کی مبہم زبان سمجھی
دہکتے سورج کی تیز کرنوں کو گن چکا ہوں
دمکتے مہتاب کی شعاؤں کی ریشمی ڈوریوں کو چھو کر
میں روح میں نور بھر چکا ہوں
تو تم کہو گے ——— بجا ہے سچ ہے
بلندیوں پر پہنچ کے تم اک نئی بصیرت سے آشنا ہو چکے ہو۔ سچ ہے۔
مگر میں تم سے یہ کہہ رہا ہوں
یہاں سوائے ہوا کی موجوں کہر کے پردوں کے کچھ نہیں ہے
میں اس بلندی پہ تم سے کٹ کر
خود اپنی ہستی کے تنگ زنداں میں گھر گیا ہوں
میں ایسا محسوس کر رہا ہوں
کہ جیسے اندھے کنویں میں گر کر
خود آپ اپنے کو ڈھونڈھتا ہوں
مگر تمھیں کیوں یقین آئے
کہ جھوٹ کا جلوۂ فروزاں صداقتوں سے کہیں زیادہ حسین و دل کش سدا رہا ہے
مگر میں سچ کہہ رہا ہوں اور اپنے سچ کی قیمت چکا رہا ہوں۔

فاصلہ

نہ پھر وہ میں تھا
نہ پھر وہ تم تھے
نہ جانے کتنی مسافتیں درمیاں کھڑی تھیں
اس ایک لمحے کے آئینے پر
نہ جانے کتنے برس پریشان دھول کی طرح سے جمے تھے
(جنھیں رفاقت سمجھ کے ہم دونوں مطمئن تھے)

اس ایک لمحے کے آئینے میں
جب اپنے اپنے نقاب الٹ کر
خود اپنے چہروں کو ہم نے دیکھا
تو ایک لمحہ
وہ ایک لمحے کا آئینہ
کتنی صدیوں کتنے ہزار میلوں کی شکل میں درمیاں کھڑا تھا
نہ پھر وہ میں تھا
نہ پھر وہ تم تھے
بس ایک ویراں خموش صحرا!
بس ایک ویراں خموش صحرا!!

بشر نواز

تو ایسا کیوں نہیں کرتے

تو ایسا کیوں نہیں کہتے
کہ یہ سپنے ہی میرے کرب کے ضامن ہیں ان ہی کے سبب سے میں
جھلستے ریگ زاروں میں برہنہ پا بھٹکتا ہوں
انھیں پرچھائیوں کو جسم دینے کی تمنا مجھ سے آسائش کا ہر لمحہ —
— مرے کی نیند، اعصابی سکوں — سب چھین لیتی ہے
یہی وہ زہر ہے، جس نے
مرے خوں کے نمک کو نیم کے رس میں بدل ڈالا

تو ایسا کیوں نہیں کہتے
کہ میں سپنوں کے اس ارژنگ کو
سورج کی جلتی بھٹیوں میں پھینک دوں، سب کچھ جلا ڈالوں
کسی لنگر شکستہ ناؤ کی مانند دھارے پہ رواں ہو جاؤں
ہر اک موج کے ہمراہ ڈوبوں اور ابھر آؤں

تو ایسا کیوں نہ کر پائے
وہ جو کچھ میرا حصہ تھا
مرا ورثہ تھا

مجھ سے چھین لیتے اور مجھے جنگل کے بے حس پیڑ کی صورت اگا دیتے
جو ہر موسم کے ہم ماہ اپنا پیراہن بدلتا ہے
ہوا کے جھونکے دیتے ہیں اجازت جس طرف بڑھنے کی، بڑھتا ہے
زمیں کی نرمیوں کو دیکھ کر اپنی جڑیں پیوست کرتا ہے
مگر تم یہ نہ کر پائے
مرا ورثہ نہ مجھ سے چھین پائے اور وہ پہلا شخص [جس نے سب سے پہلا خواب دیکھا تھا]
ابھی تک مجھ میں زندہ ہے !!

تو ایسا کیوں نہیں کرتے
انھیں سپنوں انھیں پرچھائیوں کو جسم دے ڈالو
کہ جن کو جسم دینے کی تمنا مجھ سے آسایش کا ہر لمحہ
مزے کی نیند، اعصابی سکوں — سب چھین لیتی ہے۔

بشیر بدر

غزل

پھول برسے کہیں شبنم کہیں گوہر برسے!
اور اس دل کی طرف برسے تو پتھر برسے

کوئی بادل ہوں تو تھم جائیں مگر اشک مرے
ایک انداز سے دن رات برابر برسے

برف کے پھولوں سے روشن ہوئی تاریک زمیں
رات کی شاخ سے جیسے مہ و اختر برسے

پیار کا گیت اندھیروں پہ اجالوں کی پھوار
اور نفرت کی صدا شیشے پہ پتھر برسے

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے

بلراج کومل

سرکس کا گھوڑا

سپید اور بھورا، بدن کا چھریرا
وہ نٹ کھٹ بچھیرا
خریدا گیا، گاؤں کے ایک میلے میں
لایا گیا ہنٹروں چابکوں کی پراسرار دنیا میں
سیکھے وہ انمول، دل چسپ کرتب
اٹھتے چیختے پھیلتے دائروں میں
پھلانگے سلگتی، بھیانک تکونیں
اٹھا کر چلے پیٹھ پر رقص کرتے ہوئے بندروں کو
اشاروں کی آواز سن کر وہ لپکے، ہنسے، ہنہنائے
تماشائیوں کو لبھائے، رجھائے

وہ سرکس کا گھوڑا
پریشان شہروں میں کرتب دکھاتا
تماشائیوں کے دلوں کو لبھاتا
تحیر، ہنسی، قہقہوں، تالیوں کی فضاؤں میں برسوں چھلانگیں لگاتا
اسی گاؤں کے ایک میلے میں پہنچا
خریدا گیا تھا، جہاں سے وہ بچپن میں لیکن وہاں اب؟
وہاں کون تھا؟ اس کو پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔

بلراج کومل

ایمبولنس

جو مجھ کو لائی تھی سکوں گاہ میں
وہ ایک تھی!
سپید، صرف ایک، اس کے پہلوؤں، جبیں اور پشت پر
صلیب کے نشان تھے

میں چور چور اک عظیم گھاؤ تھا
وہ مجھ کو دست مہرباں میں سونپ کر
چلی گئی تو میں غنودگی کی بے کراں، مہیب دھند میں بھٹک گیا
ہر ایک رہ گذر پر گاڑیوں، بسوں کا کارواں امنڈ پڑا
عجیب انقلاب تھا! مری نظر کے سامنے
وہ ایک پل میں سب سپید ہو گئیں
سپید، سب سپید ان کے پہلوؤں، جبین اور پشت پر
صلیب کے نشان دفعتاً ابھر کے آ گئے

الم نصیب، ان کے بے اماں مکیں
مرے ہی ہم نفس، وفا شعار وہ عزیز تھے
جو سادگی سے کوئی مشتہر فریب کھا گئے
کسی مہیب جنگ، بھوک، قحط یا وبا کی زد میں آ گئے!

بلراج کومل

کاغذ کی ناؤ

رات کو سونے سے پہلے
مجھ سے ننھا کہہ رہا تھا:
چاند لاکھوں میل کیوں کر دور ہے؟
کیوں چمکتے ہیں ستارے؟
... دو غبارے ... کالی بلی کیا ہوئی؟
میرے ہاتھی کو پلاؤ گرم پانی
.... وہ کہانی؟ ... مجھ کو نیند آنے لگی۔

نصف شب کو آتے جاتے بادلوں کے درمیاں
کچھ حروف ناتواں
بوندیوں کے روپ میں کاغذ کے
اک پرزے پہ میرے سامنے
دیر تک گرتے رہے
نظم کے نقش گریزاں نے ستم لاکھوں سہے
ان گنت برسوں پہ پھیلی چشم و دل کی داستاں
رات کے پچھلے پہر کی گود میں
تیز تر ہوتی ہوئی بارش کی لوری سن کے شاید سو گئی

صبح دم
کھل اٹھے چاروں طرف بچوں کے رنگیں
قہقہوں اور تالیوں کے شوخ پھول
رات بھر کی تیز بارش کی بنائی جھیل میں
ڈگمگاتی، ڈولتی
چل رہی تھیں چھوٹی چھوٹی کشتیاں
میں نے دیکھا ان میں ننھے کی بھی تھی
پیاری سی ناؤ
نظم کا نقش گریزاں،
جانا پہچانا سا کاغذ جانے پہچانے حروف
ننھا بولا:
آج جو تالی نہ پیٹے بے وقوف!

بلراج کومل

جزیرے

صداؤں کے تلاطم میں
اچانک موت کی آواز سنتا ہوں
بھیانک خواب جیسے شہر میں
چاروں طرف سے بڑھ رہے ہیں رینگتے سائے
انھیں سایوں میں
ان جانے حسیں چہرے
دمکتے جگنوؤں کے روپ میں
جب بھی ابھرتے ہیں
میں ان کو نوچ لیتا ہوں پریشاں تیرگی سے
ذہن میں محفوظ کرتا ہوں
کہ جب میری زمیں سے
آسماں کا فاصلہ محدود ہو جائے گا
میں ان جگنوؤں کی یاد میں
ننھے کی پیشانی پہ اپنے ہونٹ رکھ دوں گا
بلائیں لوں گا اس مہتاب کی
جو ریزہ ریزہ ہو گیا میرے ہی آنگن میں

کہوں گا میں کسی آشفتہ سر سے
مجھ میں پل بھر کو سما جاؤ
زمستاں میں تمازت کے جزیرے
میں بناؤں گا
اگرچہ اس حسیں لمحے میں بھی
چاروں طرف آواز ہوگی
موت کی آواز
لاکھوں صورتوں میں!
اور ہم سب کو ڈرائے گی
ہمیں ہر روشنی سے جانب ظلمت بلائے گی

بلراج کومل

ایک نظم

ابھی غیر دل چسپ ہو جائیں گے ہم
ابھی تم کہو گے
کہ بے کار ہے گفتگو کا بہانہ
ابھی میں کہوں گا
کہ بے کار ہے کاروبار زمانہ
ابھی تم زباں پر
سلگتی ہوئی ریت کا ذائقہ چند لمحوں میں محسوس کرنے لگو گے
ابھی میں زباں پر
کوئی خوب صورت فرشتہ صفت نام تنہائیوں میں نہیں سن سکوں گا
ابھی ذہن بیمار ہو جائیں گے سب
ابھی خواب لاچار ہو جائیں گے سب
فلک تک پہنچتے ہوئے ہاتھ بے کار ہو جائیں گے سب

بھلے یا برے ہم ابھی ہیں سلامت
ابھی ٹوٹنے کو ہے لیکن قیامت
اگر مرگ احساس کی آرزو آخری قدر ٹھہری
ابھی ایک بے جان ماضی کے صحرا میں کھو جائیں گے ہم
ابھی غیر دل چسپ ہو جائیں گے ہم

نظم

جب مسز سکھ پال سنگھ کی جرأتوں پر نظم لکھنے کے لئے
میں نے ماضی کو پکارا،
میرے کمرے میں صدائیں گونج اٹھیں :
"ڈونٹ بادر، وہ سمجھتے ہیں میں تم سے
ایزرا پاؤنڈ کی نظمیں سن رہی ہوں
وہ بھی کیا بوسہ کہ ہندوستانی بیوی کی طرح خاموش ہو"

"پرس میں کچھ بھی نہیں ہے
میرے چمکیلے بدن کی آرزو کا رنگ مصنوعی نہیں ہے"

"میں مبارک باد کی قائل سہی دھوکا نہ کھاؤ
پہلے اس کے نقش پھر آئینہ دیکھو
آخرش سکھ پال سنگھ کو میرے منہ پر کیوں مبارک باد دی تھی"

ہال کے کمرے کی کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا......
"تم سمجھتے ہو کہ جوتے نیم کی شاخوں پہ جھولا جھولتے ہیں
بیل پر کڑوے کریلے کی روپے کے نوٹ لگنے سے رہے

جاؤ ڈھونڈو کس جگہ کھو آئے ہو۔"

جس طرح ہنس مکھ مجرد دوستوں کے ہونٹ پر ننگا بدن ہو،
بند کمروں کے لطیفے ہو رہے ہوں
اور کوئی شادی شدہ عورت، کسی ایک دوست کی بیوی
زباں پر بینگنوں کا بھاؤ دے کر
رنگِ محفل میں مخل ہو۔

کیا مسز سکھ پال سنگھ کی جرأتوں پر نظم لکھنے کے لئے
میں نمبولی کی جگہ جوتے اگاؤں ؟
بیل پر کڑوے کریلے کی روپے کی نوٹ کی گڈی لگاؤں....

روؤ مت،
جاؤ بچو، جاؤ ڈھونڈو،
جاؤ ڈھونڈو کس جگہ کھو آئے ہو۔

بمل کرشن اشک

نظم

میں کل اس کے ساتھ تھی جس کے بدن سے
درد کی شدت نے احساسات کے رندھتے گلے کو گھونٹ کر
مسکرانے کی تپش، رونے کی حدت چھین لی تھی۔
لاش پر سورج کی گرمی کا اثر باقی نہ تھا
اور راشن کی دکاں، بس سٹینڈ پر کیو میں کھڑا ہو کر وہ ایسے لگ رہا تھا
جیسے اس کے منہ پہ چہرہ ہی نہ ہو
اس طرح وہ سانس لیتا تھا کہ جیسے زندگی اک فرض ہو
اپنے کمرے میں وہ کمرے ہی کی اک دیوار تھا،
جس پہ کیلنڈر نہ ہو، کھونٹی نہ ہو۔

جسم کے کپڑے تلے کچھ ہے کہ جس میں چیونٹیاں سی رینگتی ہیں
لال پیلی چیونٹیاں جن میں سے اک اک چھانٹ کر
ظلم کی چٹکی میں مسلو، تب کہیں جا کر بدن ٹھنڈا پڑے گا
میں نے جب کپڑے پہن کر بے سبب زلفیں سنواریں، لب سنوارے
چیونٹیاں سی چل رہی تھیں،
اور اب تک چیونٹیاں سی چل رہی ہیں

آج جب میں درد کی دعوت میں شامل ہو رہی ہوں
کس لئے اس بے مزہ سی سرخ ٹیریلین کی ساری سے اپنا جسم ڈھانپوں
کل جو اس نے پیش کی تھی؟

راج، وہ شلوار دینا
جس پہ پرسوں رات سکھ کے ظلم کا پیارا نشاں تھا
اب جو مدھم پڑ گیا ہے۔

بمل کرشن اشک

غزل

کیسے کہیں کہ چار طرف آئینہ نہ تھا
جاتے کہاں کہ خود سے پرے راستہ نہ تھا

چپ سانس لے رہی تھی درختوں کے آس پاس
آواز دے رہی تھی کوئی بولتا نہ تھا

خود سے چلے تو رہ گزر آئینہ ہو گئی
اپنے سوائے اور کوئی سوجھتا نہ تھا

اب کے بسنت آئی تو آنکھیں اجڑ گئیں
سرسوں کے کھیت میں کوئی پتہ ہرا نہ تھا

پردہ ہلا کے باد سحر دور تک گئی
خوش بو کدھر سے آئی کسی کو پتا نہ تھا

گذری تمام عمر اسی شہر میں جہاں
واقف سبھی تھے گو کوئی پہچانتا نہ تھا

اے اشک اک کتاب پڑی تھی ورق ورق
وہ تیرگی تھی لفظ کوئی سوجھتا نہ تھا

پرکاش فکری

غزل

جسم کی حد سے ذرا اور بھی آگے نکلو
قید رفتار سے آزاد ہواؤں میں اڑو

ان مناظر میں تری جان سی پڑ جائے گی
سبز تاروں کو کرو چاند کو نیلا کر دو

اک عجب رنگ سا ہے الفاظ کے پیکروں سے پرے
اس کے چہرے کو ذرا غور سے اک پل دیکھو

کل جو آئے گا کوئی بھید وہ ایسا تو نہیں
آنکھ رکھتے ہو تو دیوار پہ لکھا پڑھ لو

ڈھونڈھ پاؤ گے کبھی اور نہ گھر کا رستہ
جال پھیلے ہیں ہر اک سمت نہ تنہا نکلو

باس مٹی میں ملے گی مری اک دن فکری
میں تمھارا ہوں مگر دور کا رشتہ رکھو

غزل

جسم کو سونگھ گیا سانپ اندھیری شب کا
چشم خوں بار لئے نیند کی زد میں آیا

کیوں ترستا ہے کوئی آئے صدائیں دینے
کیا گیا وقت کبھی لوٹ کے واپس آیا

تہ سے پانی کے وہی چاندی سی مچھلی ابھرے
آج ساحل پہ اسی شوق میں دن ہے گذرا

دل گرفتہ سے در و بام فسردہ لمحے
آنکھ کا درد بنا خواب سہانے پل کا

یہ بھلاوا ہے محض ڈوبتے دن کا فکری
جو بڑا ہے مری قامت سے بھی میرا سایہ

تاج مہجور

دوسری بات

بہت مدتوں بعد اک دن اچانک
مجھے راہ چلتی ہوئی مل گئی وہ
کہ فردوس گم گشتہ مل جائے جیسے
پھر اس روز
جب میں نے اس کو بتایا
کہ دل میں ابھی تک
تری آرزو کی نجیلی کنواری
لبوں پر خموشی کی مہریں لگائے
مری چشم بے خواب کی چلمنوں سے
مسلسل ترا راستہ دیکھتی ہے
تو وہ مسکرائی
مگر وہ تبسم
میرے واسطے اس قدر اجنبی تھا
کہ دل میں
نہ کلیاں ہی چٹکیں نہ گل مسکرائے
نہ بجلی سی لہرائی نظروں کے آگے
نہ انگڑائی لے لے کے ارمان جاگے
پھر اپنی پریشاں نگاہیں جھکا کر
بہت ہچکچا کر
کہا اس نے مجھ سے
"مگر اب تو یہ —
چھوڑیئے دوسری بات کیجئے
کہیں کوئی اچھا مکاں ہو تو کہیے
مگر اس کے نزدیک
اچھا سا ماڈرن اسکول بھی ہو"
مجھے یوں لگا
میرے لب سل گئے ہیں!

حسن فرخ

کل برہنہ ملی تھی مجھے

تیرگی کے پہاڑوں سے ٹکراتی پھرتی ہے
افکار کی چاندنی
روشنی کی لکیریں کھلی کھڑکیوں سے
چڑھاتی ہوئی رات کا منہ
اندھیرے مکانوں میں داخل ہوئیں
دودھیا شیشے پر چھائیوں کے مچلتے ہوئے پیکروں کو
چھپانے کی کوشش میں کچھ اور دھندلا گئے
دستکیں اپنی شرمندگی کو
ہتھیلی کی سرحد پہ ہی دفن کرنے لگیں
ہڈیاں گوشت کے خوب صورت غلافوں میں
پھر سے لپٹنے لگیں
زندہ رہنے کا ہر فلسفہ
نیند کی کھائی میں کھو گیا
کھٹکھٹاتی ہوئی رات کے اونچے اونچے
مکانوں کے دروازوں کو
کل برہنہ ملی تھی مجھے
اصطلاحوں کا پیراہن اوڑھے ہوئے زندگی

حسن کمال

نیا گیت

گھنٹہ بھر چھم چھم برس گئے بادل
برس گئے بادل
شاخوں کے ہونٹوں سے دھول گرد کھینچ کے
الھڑ درختوں کو باہوں میں بھینچ کے
دھرتی کی چولی کو کس گئے بادل
برس گئے بادل
برساتی، چھتری، ٹاٹ، بورے نکال کے
موٹر کے پہیوں سے کیچڑ اچھال کے
ریلوں کی پٹری میں پھنس گئے بادل
برس گئے بادل
کھولی کے پردے، چٹائی بکھیر کے
ساجن کی محنت پہ پانی سا پھیر کے
گاڑھی کمائی کو ڈس گئے بادل
برس گئے بادل
گھنٹہ بھر چھم چھم برس گئے بادل
برس گئے بادل

حمدون عثمانی

ندائیت

فکر و دانش سے ورا

ان گنت قرنوں سے یوں ہی
اپنے دامن میں سمیٹے، ایک لامحدود
سب کچھ
دیدۂ حسرت سے تکتے، بھیگتے نقطے، لکیریں
غیر متوازی، توازن کو لئے
کشتیٔ دریا رواں ہے
لوگ کہتے آئے ہیں اس کو
متمم
سوچتا ہوں
اس قیاس محتمل ضدین کو
میں کیا کہوں
مجھ کو طے کرنے پڑے ہیں
سرد لمحے اور کسیلے راستے
میں نے دیکھے
زرد دن، تاریک رات
چلتے، پھرتے، سانس لیتے بولتے

بیت الخلا

ابن آدم کا نہیں مجھ کو پتہ
گر
متمم بھی کہوں تو میں کسے
تجربوں کے ہاتھ میں گویائی ہے،
جب بھی کچھ حسی اعادہ کر سکا
ذہن نے دی ہے صدا۔
سرد لمحوں اور کسیلے راستوں پر
بڑھ رہا ہے
لمحہ لمحہ
دست ابیض!
دے چکا ہے قلب بھی مجھ کو جواب
سم بادہ سے لہو ہے چیختا
پھر بھی مجھ میں اک توانائی ہے
موجیں مارتی
اے مرے ماحول کچھ تو ساتھ دے
تاکہ میں
اس توانائی کا کچھ تو استحالہ کر سکوں!

ندا آئی
انبوہ شیدائیاں
نازنینان شہر تخیل
غزالان فکر و نظر
غم گساران دار و صلیب و رسن
دیر سے عقیدت کی نایاب سوغات لے کر
در گنبد فن پہ سجدہ کناں ہیں

پئے دیدن منظر شاد کاماں
بڑی تمکنت سے اٹھا
اٹھ کے میں نے
جو دیکھا تو حد نظر تک فرو کش
لہو کی لکیروں کا اک کارواں تھا
کبھی جو رگ و پے میں میری رواں تھا

راج نرائن راز

خود کلامی

نارسی سس نہ بنو
جھیل کی تہ میں کبھی جھانک کے دیکھا نہ کرو
اس کا شفاف
حسیں
۔ اور بلوریں سینہ
چہ بربادی ہے
ایسے غافل نہ بنو

اور فی یس نہ بنو
اپنے ماضی کی حسیں یاد کو دھیرے دھیرے
اپنے پیچھے ـــــ
ـــــ صفت سایہ چلی آنے دو
اتنے بے تاب ہو کیوں !
آنکھ افق پر رکھو
کام لو ہوش سے، یوں لوٹ کے دیکھا نہ کرو
یوری ڈس عالم اسرار میں کھو جائے گی
اس کے قائل نہ بنو

عرفان

رات اماوس کی تھی ـــــ میں نے
ناگ پھنی کے اک کانٹے پر
اک پل کے سوویں حصے تک
سورج کو روشن دیکھا تھا

پھیل گیا میری آنکھوں میں
سو راتوں کا گھور اندھیرا
اور مجھے محسوس ہوا یوں
گھور اندھیرے کے سینے میں
میں بجلی کا اک کوندا ہوں

رؤف خلش

دائرے

اگر لمس کی لذتیں ڈولتی شہ رگوں میں نہ اتریں
اگر سنسناتی ہوئی آنچ کی بجلیاں،
لپک کر نہ اک دوسرے سے لپٹنے لگیں
یقیناً بدن اس سمے اک شکستہ کھنڈر ہے
مگر اس شکستہ کھنڈر میں بھی چنگاریاں کچھ ملیں گی:
نظر — جو کہ بند انکھڑیوں میں
ترستی ہوئی مسکراہٹ کو پہچانتی ہے،
وہ احساس — جو دھیمی اک گونج بن کر
سبھی فاصلے روح کے طے کرے ہے،
کئی دائرے — ان کہی ان سنی خواہشوں کے
ابھرتے ہیں چنگاریوں میں چھپی ٹھنڈکوں سے،
نہیں جن کو حاجت حرارت بھرے جسم کی
انھیں بس پسینے میں ڈوبی ہوئی، تربہ تر اک ادا
لہکتی ہوئی تیز خوش بو کا اک سلسلہ چاہیے،
کہ ان دائروں کی تھرکتی لکیریں بڑی منحنی ہیں
یہ اپنی تھکاوٹ کا رنگیں بدل چاہتی ہیں

رؤف خلش

اکتاہٹ

بہت دہرا چکے بے جان لفظوں میں
جنوں کی بات، چاہت کی کہانی
زبانیں رٹتے رٹتے تھک گئی ہیں
ستم، انساں، روایت، زندگانی
سنہرے خواب بنتی ہے، نئے چولے بدلتی ہے
گھٹن غم کی، بدن کی پیاس، لذت کی ترنگ
کہاں تک زلزلوں میں گرتی شہتیریں سنبھالیں
کہاں تک گیلی اینٹوں کو سہارا دیں
فضا میں تیز خوش بو پھیل جاتی ہے
لہو میں گرم ٹیسیں سنسناتی ہیں
کوئی ڈھا دے عمارت روشنی کی،
کوئی پردے ہٹا دے آسمانوں سے
یہ آنکھیں:
ڈھونڈ لیں گی کچھ نئے منظر اندھیرے میں!

زبیر رضوی

موسم کا المیہ

پرندے
فضاؤں کی لہروں پہ
ننھے سفینوں کی مانند بہتے ہوئے
وسعتیں ناپتے ہیں
سہانی رتیں
دیرے دف لئے
اپنے ہاتھوں میں، اس بات کی منتظر ہیں
ہوائیں پرانی کتھاؤں کو
پاؤں پڑے گھنگروؤں کی زباں میں سنائیں
گھٹائیں
مناظر کی آنکھوں میں
کاجل کی ہلکی لکیریں سجانے اٹھی ہیں
زمیں کے بدن پر
پڑے آبلوں کی جلن مٹ گئی ہے
زمیں کا بدن تازہ پھولوں کی مانند پھر جل اٹھا ہے
کہیں دور
شاخوں میں الجھا ہوا ایک زخمی پرندہ
فضاؤں کی لہروں پہ بہتے ہوئے
وسعتیں ناپنے کے جتن کر رہا ہے

زبیر رضوی

غزل

دل کے تاتاریں یادوں کے اب آہو بھی نہیں
آئینہ مانگیں جو ہم سے وہ پری رو بھی نہیں

دشت تنہائی میں آواز کے گھنگھرو بھی نہیں
اور ایسا بھی کہ سناٹے کا جادو بھی نہیں

زندگی جن کی رفاقت پہ بہت نازاں تھی
ان سے بچھڑی تو کوئی آنکھ میں آنسو بھی نہیں

چاہتے ہیں رہِ مے خانہ نہ قدموں کو ملے
لیکن اس شوخی رفتار پہ قابو بھی نہیں

تلخیاں نیم کے پتوں کی ملی ہیں ہر سو
یہ مرا شہر کسی پھول کی خوش بو بھی نہیں

جانے کیا سوچ کے ہم رک گئے ویرانوں میں
پرتو رخ بھی نہیں سایۂ گیسو بھی نہیں

حسن امروز کو تشبیہوں میں تولیں کیسے
اب وہ پہلے سے خم کاکل و ابرو بھی نہیں

بے حجاب ایسے کہ پہلو سے نہ ہٹ کر بیٹھیں
احتیاط ایسی کبھی ہم کو کہا تو بھی نہیں

ہم نے پائی ہے ان اشعار پہ بھی داد زبیر
جن میں اس شوخ کی تعریف کے پہلو بھی نہیں

شاذ تمکنت

سر لبستہ

رت پھری، بھور پون جھوم کے اٹھلا کے چلی
کیا ہوا اب کے کسی نے مجھے پاگل نہ کہا
میں نے دیکھا نہیں کس طرح کھلی، بند کلی

بھری برسات بھلی آئی بھلی بیت گئی
سن سے جھونکے نہ چلے چمن سے نہ شبنم ٹپکی
رنگ کی گرد سر صحن شفق بیٹھ گئی
پیش ساقی نہ مری اوک سے صہبا چھلکی
بند کمرے کے دریچوں کے سنہرے شیشے
سانولی بدلی کے ٹکرانے سے زخمی نہ ہوئے
تھی شب ماہ سے اشکوں کی شناسائی بہت
اب کے اپنے دل گم گشتہ کی یاد آئی بہت

میں کہ ہوں قاف طلسمات کے نغموں کا سفیر
کوئی بتلائے کہ کس شہر میں آ پہنچا ہوں

شاذ تمکنت

جوہرِ عرضِ ہنر سیم نہیں، زر نہ سہی
دست و بازوئے معیشت کا یہ زیور نہ سہی
بوئے گل نکہت گندم کے برابر نہ سہی

مجھ میں سویا ہوا دیوانہ یہ چلاتا ہے
دن کی توقیر بجا، رات سے انکار نہ کر
خلوت دل کی ملاقات سے انکار نہ کر

سوچ میں گم ہوں یہ رہ رہ کے خیال آتا ہے
کہ میں اک عالم سربستہ ہوں، سیارہ ہوں
وہی شب گرد ہوں، سودائی ہوں، آوارہ ہوں
شورش دہر مجھے بھیک دے تنہائی کی
کہ یہ احساس نہ مرجائے کہ میں زندہ ہوں

شاذ تمکنت

آب و گل

مجھے یاد پڑتا ہے اک عمر گذری
لگاوٹ کی شبنم میں لہجہ ڈبو کر
کوئی مجھ کو آواز دیتا تھا اکثر
بلاوے کا معصومیت کے سہارے
میں آہستہ آہستہ پہنچا یہاں تک
بہ ہر سمت انبوہ آوارگاں تھا
بڑے چاؤ سے میں نے اک اک سے پوچھا
"کہو کیا تم ہی نے پکارا تھا مجھ کو"
کہو کیا تم ہی نے پکارا تھا مجھ کو"
مگر مجھ سے انبوہِ آوارگاں نے
ہراساں ہراساں پریشاں پریشاں
کہا صرف اتنا "نہیں وہ نہیں ہم
ہمیں بھی بلا کر کوئی چھپ گیا ہے۔"

شاذ تمکنت

شکستِ انا

یہ جبیں، مطلعِ خورشید جہان بیدار
شش جہت کے یہ ستوں بازوئے سنگلاخ وجواں
میری امیدگہ نور، یہ آنکھیں یہ دماغ
آج چپ چاپ ہوئے گرم لہو میں غلطاں
کس سے فریاد کروں درد مجسم ہوں میں
تو نے جانا بھی کہاں وقت ہوں زخم ہوں میں
اب بھلا کیسے جگاؤں کہ گراں خواب ہے تو
مجھ کو معلوم نہ تھا شاذ کہ سہراب ہے تو

لب جوئے شیر

بھرے بھرے جسم والی عورت
جو بار بار اپنے ننھے بچے کو
اپنے سینے لگا رہی ہے
عجیب سی
اک لطیف خواہش
یہ دیکھ کر دل میں جاگ اٹھی ہے
میں کاش!
اس کے گداز سینے پہ سر کو رکھ دوں
اسی طرح یہ، مجھے بھی اپنے
گداز سینے، گداز باہوں سے بھینچ ڈالے

شمیم نفی

غزل

کیوں پریشان ہوا جاتا ہے دل کیا جانے
کیسا پاگل ہے کہ پانی کو بھی صحرا جانے

ہیں وہ آوارہ کہ بادل بھی خفا ہیں مجھ سے
تو زمانے کو بھی ٹھہرا ہوا لمحہ جانے

دھوپ کی گرد فضاؤں میں دلوں میں تابوت
ہر نفس خود کو بس اک آہ کا شعلہ جانے

اوس کی بوند بھی اب سنگ صفت لگتی ہے
پھول کے باغ کو دل آگ کا دریا جانے

رات پتھر میں ڈھلی چاند بھی کالا نکلا
ایسے منظر کو بھی یہ آنکھ تماشا جانے

بے صدا گنبد احساس، ہوا مہر بہ لب
پھول کے درد کا قصہ کوئی کانٹا جانے

دن کی خندق کا دھواں شہر سے آگے بھی گیا
کس طرح گھر کا پتہ کوئی پرندہ جانے

بس یوں ہی گرم سفر آٹھ پہر رخش نظر
نہ تو منزل سے خبردار نہ رستہ جانے

میں ازل سے ہوں اسی طرح گریزاں خود سے
اور ہر شخص مجھے صرف نکما جانے

شہاب جعفری

سورج کا شہر

(غریب شہر کی ڈائری سے)

"نہیں! — یہ سورج کے شہر کا آدمی نہیں ہے
کہ یہ تو مرنے کے بعد فٹ پاتھ پر پڑا ہے
یہ لاش ہم سب کی طرح سورج کے ساتھ گردش میں کیوں نہیں ہے!!
پڑھو تو اس ڈائری میں کیا ہے"

پچھے کھچے اک ورق پہ کچھ یوں لکھا ہوا تھا:—

"میں اپنی دنیائے فکر وفن تج کے آج بن باس میں پڑا ہوں
ضرورتوں میں گھرا ہوا ہوں
یہاں تو دو اور دو کا حاصل ہمیشہ ہی چار ہاتھ آیا—
کہ پانچ ناممکنات میں ہے
عظیم فن کار کا قلم ہو کہ کارخانے! —
کسی کو تخلیق حسن کی آرزو نہیں ہے
مقدس آگ ان کے دل کی یوں پیٹ کے جہنم میں جل رہی ہے
کہ زندگی کی جو قوتیں ہیں وہ صرف زندہ ہی رہنے میں صرف ہو رہی ہیں۔

شہاب جعفری

مشین کی طرح ذہن بھی کام کر رہے ہیں
رگوں میں جیسے لہو کے بدلے رقیق لوہا بھرا ہوا ہے
مشین کی طرح پانو چلتے ہیں
آدمی کا جلال گردش میں سرنگوں ہے
ارادہ و اختیار اک اضطراب سنگیں ہے جس سے بچ کر
کوئی نہیں دو گھڑی کسی سے جو بے غرض رک کے بات کر لے
(کسے خبر — ؟ آدمی کے دو میٹھے بول کو میں ترس گیا ہوں!)"

یہاں یہ تحریر آنسوؤں سے مٹی ہوئی تھی — اور اس سے آگے
"یہ شہر، سورج کا شہر ہے، اس کے روز و شب کا پتہ نہیں کچھ
نہ آج تک وقت اور تاریخ کا مجھے علم ہو سکا ہے
کہ میرے احساس میں کوئی آج ہے نہ کل!
اور یہ رات ہے یا سیاہ سورج!؟
غروب ہو کر بھی آسمان و زمیں سے پیہم گذر رہا ہے!!
بس اس جہاں میں — سیاہ و روشن — ہمیشہ دن ہے
ہمیشہ سورج ہی اپنے سر پہ کھڑا ہوا ہے
یہ کائنات اک شکستہ گاڑی ہے، ایک پہیے پہ چل رہی ہے

شہاب جعفری

(زمیں کا چاند، کیا خبر، کس اندھیرے پاتال میں گرا ہو!)
ہر ایک شے بھاگتی ہوئی ایک دوسرے کی تلاش میں گم
بس اک تصادم!
ہر ایک شخص ایک دوڑتی لاش ہے — کہ اک دوسرے سے وحشت زدہ، گریزاں
سب اپنا سورج سے منہ چھپائے، تلاش میں وقت کی ہراساں

کسی کو اتنی بھی شام ملتی نہیں — کہ تھوڑا اداس ہولیں۔"

یہاں پہ جلسے عجیب سے تھے — لہو کے دھبوں سے مٹ گئے تھے!

شہاب جعفری

غزل

شام رکھتی ہے بہت درد سے بے تاب مجھے
لے کے چھپ جا کہیں اے آرزوئے خواب مجھے

اب میں اک موج شب تار ہوں ساحل ساحل
راہ میں چھوڑ گیا ہے مرا مہ تاب مجھے

ساحل آب و سراب ایک ہے منزل منزل
تشنگی کرتی ہے سیراب نہ غرقاب مجھے

دشت در دشت مرے سر سے گذرتا سورج
لے کے ڈوبا ہے یہی نور فلک تاب مجھے

اپنی دھرتی پہ نہ میں ہوں نہ مرا سایہ ہے
نظر آتا نہیں کچھ دیدۂ بے خواب مجھے

میں بھی صحرا ہوں مجھے سنگ سمجھنے والو
اپنی آواز سے کرتے چلو سیراب مجھے

میں بھی دریا ہوں ہر اک سمت رواں ہوں کب سے
میرا ساحل بھی نہیں منزل پایاب مجھے

اب مجھے ڈھونڈ نہ آغوش گریزاں ہر سو
لے اڑی خاک بہائے گیا سیلاب مجھے

شام پوچھے تو نہ کہنا کہ میں دنیا میں نہیں
لے کے پھر آئے گا اس گھر میں مرا خواب مجھے

غزل

عجیب سانحہ مجھ پر گذر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

ہر ایک زخم، مرے دل کا بھر گیا یارو
ہر ایک نقش تمنا کا ہو گیا دھندلا

بھٹک رہی تھی جو کشتی وہ غرق آب ہوئی
چڑھا ہوا تھا جو دریا اتر گیا یارو

وہ کون تھا، وہ کہاں کا تھا، کیا ہوا تھا اسے
سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

میں جس کو لکھنے کے ارمان میں جیا اب تک
ورق ورق وہ فسانہ بکھر گیا یارو

شہریار

عہدِ حاضر کی دل ربا مخلوق

زرد بلبوں کے باڑوں میں اسیر
سخت بے جان لمبی کالی سڑک
اپنی بے نور دھندلی آنکھوں سے
پڑھ رہی ہے نوشتۂ تقدیر
بند کمروں کے گھپ اندھیروں میں
بلیاں پی رہی ہیں دودھ کے جام

ہوٹلوں سینما گھروں کے قریب

چمچماتی ہوئی نئی کاریں
اور پنواڑیوں کی دوکانیں
اور کچھ ٹولیاں فقیروں کی
پرس والوں کے انتظار میں ہیں

ادھ پھٹے پوسٹروں کے پیراہن
آہنی بلڈنگوں کے جسموں پر

کتنے دل کش دکھائی دیتے ہیں
بس کی بے حس نشستوں پر بیٹھی
دل کے بازار سے خریدی ہوئی
آرزو، غم، امید، محرومی
پینٹ گڑیا قمیز چوہے دان
کیلے امرود سنگترے چاول
نیند کی گولیاں گلاب کے پھول
ایک اک شے کا کر رہی ہے حساب
عہدِ حاضر کی دل ربا مخلوق!

شہریار

ایک نظم

تیری سانسوں کی سرگم سے بدمست ہونے لگیں
شاخ تنہائی کی نرم بھیگی ہوئی پتیاں
ہر گذرگاہ پر لڑکھڑانے لگیں
سرمئی سبز پرچھائیاں
آسماں پر افق در افق لہلہانے لگیں
خواب کی کھیتیاں

موج در موج سرگوشیوں کی صبا
سرخ ہونٹوں کو سرشار کرنے لگی
اک نیا جرم کرنے پہ اصرار کرنے لگی

جھاڑیوں میں ہوا سرسرانے لگی
جسم پگھلی ہوئی آگ میں غسل کرنے لگے

شہریار

دھندلکا

منزلوں کی گود میں سمٹے ہوئے
نقش پائے رفتگاں
رہ گزر کی گود سے لپٹی ہوئی
آنے والے قافلے کی اس پر
اک صدائے نیم جاں
ہے جرس کی کوکھ میں اب تک نہاں

ریت کے ذرے شفق کی روشنی کو دیکھ کر
ساکت و بے حس فلک کے سائے میں پھیلے ہوئے
صحرا سے کچھ کہنے لگے

منزلوں کی گود میں سمٹے ہوئے
نقش پائے رفتگاں ہنسنے لگے

اسٹل لائف

پھول ، پتیاں ، شاخیں
ہونٹ ، ہاتھ اور آنکھیں
موج خوں ، صدائے دل
ماہ تاب اور سورج
منجمد ہیں سب کے سب
وقت کی کماں میں اب
تیر ہی نہیں کوئی

شہزاد احمد

غزل

طے ہوں گے کس طرح یہ مراحل کہا نہ جائے
اس تیرگی میں کیا ہے مقابل کہا نہ جائے

خود دے دیئے ہیں میں نے اسے ہاتھ کاٹ کر
وہ لکھ دیا ہے جو سرِ محفل کہا نہ جائے

پتھر ہوئے وہ لفظ کہ [illegible] [illegible] جا گئے
اس خامشی سے کیا ہوا حاصل کہا نہ جائے

اب تک تو چل رہے ہیں تمہارے ساتھ ساتھ ہم
آئے گی کس جگہ حدِ فاصل کہا نہ جائے

نشہ ہے یا کہ زہر فضا میں ملا ہوا
کچھ ہے ہر ایک چیز میں شامل کہا نہ جائے

آخر کہیں تو بیٹھ گئے پاؤں توڑ کر
پھر کیا کہیں اگر اسے منزل کہا نہ جائے

یہ اور بات کچھ بھی دکھائی نہ دے سکے
آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو غافل کہا نہ جائے

شہزاد احمد

غزل

ڈر کے جب رات سے خورشید پلٹ جائے گا
میرا سایہ میرے سینے سے لپٹ جائے گا

آنکھ مند جائے گی جاگی ہوئی آوازوں کی
راستہ رات کے ذرات سے اٹ جائے گا

دھوپ کی پہلی کرن آگ لگا دے گی مجھے
ابر کے ساتھ مرا رنگ بھی چھٹ جائے گا

چھوٹ جائے گا مرے ہاتھ سے زہراب کا جام
دشت کو دیکھ کے سیلاب پلٹ جائے گا

لوگ جب مجھ کو نظر آئیں گے اپنے جیسے
اپنی محرومی کا احساس بھی گھٹ جائے گا

بند کرلی ہیں جسے دیکھ کے آنکھیں شہزاد
وہی لمحہ مری آنکھوں سے چمٹ جائے گا

شہزاد احمد

یہ تمنا عبث

اسے دیکھنے کی تمنا عبث
وہ کیسا لگے گا؟
ابھی دھندلی دھندلی لکیروں نے چہرہ بنایا نہیں
ابھی اس کی آواز بھی ریشہ ریشہ ہے
اس نے گزرتی ہوئی ساعتوں کو بنایا نہیں
ابھی برف کی تہ کے نیچے ہیں آنکھوں کی جھیلیں
ابھی جھیل کی مچھلیاں زرد سورج کی کرنوں سے محروم ہیں

مگر کیا خبر؟
وہ ازل سے ابد تک اسی کیفیت میں رہے!
یا مری آنکھ اس کی بدلتی ہوئی رنگتوں سے شناسا نہ ہو
میں اسے کیوں ادھورا کہوں؟
میری آنکھیں ہی شاید مکمل نہ ہوں

یہی سوچتے سوچتے مجھ کو نیند آ گئی
اور ہوا دیر تک کانوں میں کہتی رہی: "دیکھ لے، دیکھ لے"

شہزاد احمد

میں نے گھبرا کے آنکھیں اٹھائیں
وہاں تیرگی کے سوا ـــــ اور کوئی نہ تھا
میں نے دل سے کہا
رات کافی پڑی ہے ابھی سو رہیں
ـــــــــ سو رہیں

ابھی نیند کا پہلا جھونکا بھی آیا نہ تھا
پھر ہوا نے کہا ـــــ "دیکھ لے، دیکھ لے
خامشی رنگ ہے!
تیرگی کی صدا سنگ ہے!
بنتے مٹتے ہوئے روز و شب نقش پا سے زیادہ نہیں
اور تو سوچتا ہے کہ تکمیل ہو
چہرے اتنے شناسا ہوں تو ان کو پہچان لے
یہ تمنا عبث!"

صادق مولیٰ

نرجا ۳

تم مری کھوج میں
یوں ہی تاریک غاروں، مٹھوں، معبدوں، خانقاہوں میں
گھٹ گھٹ کے مر جاؤ گے
میں نہیں مل سکوں گا تمھیں اب کبھی
دھرم میں، سنگھ میں، دھیان میں، گیان میں

نیلے ساگر کی تہ میں اتر کر
برازیل کے جنگلوں میں بھٹک کر
ہمالہ کی چوٹی پہ چڑھ کر
مجھے تم نہ آواز دو

یاس کو تیاگ کر
آس کے بام پر
میری آمد کے لیکن رہو منتظر
میں ضرور آؤں گا

صادق سولی

سوکھ کر وقت جس دن تڑق جائے گا
دودھ کی طرح آکاش پھٹ جائے گا
دن کے ٹکڑے زمیں پر بکھر جائیں گے
رات کے سر کا ہر بال جھڑ جائے گا
چاند، سورج سما جائیں گے جب مرے گریہ میں
اور سارا اجالا پگھل کر اندھیرے میں بہہ جائے گا

بس اسی وقت تم، ہانپتے کانپتے، لعنت لمحہ کو ہاتھوں میں پکڑے ہوئے
خوف کے کواڑے سے جھانک کر — دیکھ لو گے مجھے ...
.. اور میں
منہ سے اک قہقہہ تھوک کر، سوریہ منڈل سے باہر نکل آؤں گا
اس دھرا تل کو کھاؤں گا، سارے سمندر کو پی جاؤں گا
دیکھتے دیکھتے
آکسیجن میں تبدیل ہو جاؤں گا
پھر خلاؤں کے ساگر میں کھو جاؤں گا

صبا جائسی

غزل

ہم اپنے آپ سے کچھ دیر گفتگو کر لیں
تمھاری یاد نہ آتی تو آج بہتر تھا

نہ قافلہ نہ غبار سفر نہ سایہ کوئی
ہمارے ساتھ تو جو کچھ تھا دامن تر تھا

خیال و خواب سے کیوں کر جنوں کو ہوش آیا
تمھارا ذکر تھا یا زندگی کا نشتر تھا

حیات جاں کہاں کس سے ہوتی داد طلب
دل حیات کا ہر زخم خود ہی خنجر تھا

نہ جانے کس لئے دنیا یہی سمجھتی ہے
نہ میں تھا درد کا مارا نہ تو ستم گر تھا

خبر نہ تھی کہ تقاضائے زندگی کیا ہے
کسی کی بزم پہ ہم کو گمان محشر تھا

صہبا وحید

ہاویہ

یہ افراد کی اجتماعی ہیئت!
شعور و جبلت کی گونگی اکائی
سدا ضرب و قسمت کی تقویم بن کر
گرفتارِ سجین بیم و رجا ہے!
مرے درد کا کیا مداوا کرے گی؟
مرے درد کا کیا مداوا کرے گی؟

اصول و مبادی، اوامر، نواہی
یہ اقدار کا ایک تجریدی پنجر
یہ رشتے، یہ ناطے، مراسم، روابط
یہ شائستہ، فہمیدہ، بالغ رویے
وہ الفاظ کا سامرانہ تنوع
کہ بازی گرانِ معانی نے جس پر
بڑی تن دہی سے ملمع کیا ہے
بجز التباسِ حقیقت یہ کیا ہے؟
بجز التباسِ حقیقت یہ کیا ہے؟

سلاسل بہ پا روحِ انسانیت ہے
اٹھاؤ یہ تابوتِ آداب و قدغن
جلا دو، یہ اوراقِ فکرِ پریشاں
سعیر و سقر کی نمائندہ سوچیں
مرے درد کا کیا مداوا کریں گی؟
کہاں قدسیانِ خلوص و وفا ہیں؟
ازل تا ابد ہاویہ، ہاویہ ہوں
ازل تا ابد ہاویہ ہاویہ ہوں

عادل منصوری

وقت کی پیٹھ پر

وقت کی پیٹھ پر
کچھ لمحوں کے دھاگوں میں لپٹا ہوا
شبہ کی سیڑھیوں پر سرکتا ہوا
نت نئے خودکشی کے طریقوں کا موجد بنا
حبشی راتوں کے جنگل میں بکھری ہوئی
لمس کی ہڈیاں
چن رہا ہوں نہ جانے میں کس کے لئے؟
جب مرے نام کے لفظ تنہا تھے لوگو!
تمھیں سرخ ہونٹوں کی خیرات
کیسے ملی یہ بتاؤ؟

ریفری جریٹر میں رکھی ہوئی
طشتری میں میری دونوں آنکھیں
برہنہ پڑی تھیں
وہاں تک کسی خواب کے ہاتھ پہنچے نہیں تھے
کبوتر کی آنکھوں میں
ٹوٹے ہوئے آسماں کا تنزل نہ دیکھو
بدن کے شکستہ کھنڈر سے نکل بھاگنے کے لئے پھر
تمھاری مدد کی ضرورت ہے مجھ کو

عادل منصوری

گرد

"سٹی لائٹ بکس" کے دفتر کے
ادھ کھلے دروازے میں
مٹھیاں بھینچے کھڑے
ایلن گنسبرگ کے گلے میں لٹکے
اژدھے کی ترچھی آنکھوں میں
چکراتے آسمان سے گرتے
"ہاؤل" اور دوسری کویتاؤں کے
پیلے کاغذ پر پھیلی ہوئی سیاہی
ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کے لمبوترے چہرے پر
دھیرے دھیرے پھیل رہی ہے
او تھانٹ کے موٹے، کالے ہونٹوں سے چاٹی ہوئی
دنیا کی چکناہٹ کو سونگھتی کالی چیونٹیاں
بنارس کے سرمنڈے سادھوؤں کی چلموں میں
سر چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں
مارلون براندو کی
جامد حرکتوں کے پتھر
پھر برسنے لگے ہیں

عادل منصوری

غزل

جلنے لگے خلا میں ہواؤں کے نقش پا
سورج کا ہاتھ شام کی گردن پہ جا پڑا
چھت پر پگھل کے جم گئی خوابوں کی چاندنی
کمرے کا درد ہانپتے سایوں کو کھا گیا
بستر میں ایک چاند تراشا تھا لمس نے
اس نے اٹھا کے چائے کے کپ میں ڈبو دیا
ہر آنکھ میں تھی ٹوٹتے لمحوں کی تشنگی
ہر جسم پر تھا وقت کا سایہ پڑا ہوا
دیکھا تھا سب نے ڈوبنے والے کو دور تک
پانی کی انگلیوں نے کنارے کو چھو لیا
آئے گی رات منہ پہ سیاہی ملے ہوئے
رکھ دے گا دن بھی ہاتھ میں کاغذ پھٹا ہوا

عادل منصوری

غزل

بسمل کے تڑپنے کی اداؤں میں نشہ تھا
میں ہاتھ میں تلوار لئے جھوم رہا تھا

گھونگھٹ میں مرے خواب کی تعبیر چھپی تھی
مہندی سے ہتھیلی میں مرا نام لکھا تھا

لب تھے کہ کسی پیالی کے ہونٹوں پہ جھکے تھے
اور ہاتھ کہیں گردن مینا پہ پڑا تھا

حمام کے آئینے میں شب ڈوب رہی تھی
سگرٹ سے نئے دن کا دھواں پھیل رہا تھا

دریا کے کنارے پہ مری لاش پڑی تھی
اور پانی کی تہ میں وہ مجھے ڈھونڈ رہا تھا

معلوم نہیں پھر وہ کہاں چھپ گیا عادل
سایہ سا کوئی لمس کی سرحد پہ ملا تھا

عتیق تابش

زخم رسیدہ اکائی

میں کبھی کوئی ایسا
فلسفہ، نظریہ، قدر تسلیم کرنے کا حامی نہیں ہوں
جس کی تاثیر ہو محض وقتی، اضافی
میں تجسس میں رہتا ہوں
دائمی استعاروں
خوف سے بعد تر، دیرپا، ٹھوس اجلے خیالات کی
مجھ میں شامل نہیں غیر آسودگی
اور نہ حامل رہا منفیانہ رویوں کا پہلے کبھی
سچ یہی ہے کہ میں جیتا اور جاگتا ایک انسان ہوں
سچ اگر ہے تو میں
سچ اگر ہے تو ہم
—— ہمارا تعلق ہے اک دائمی زندگی سے
ہم ہی روح ابدیت سے مربوط ہیں
ہم یہاں آئے ہیں
—— نہ تو مرحوم آباد و اجداد کی تربتوں پر لہو ریزیوں کے لئے
اور نہ تاریخ کے سادے اوراق پر اپنی سچائیوں، معرکوں کی نئی داستانوں

عتیق تابش

کی تحریر کے واسطے

میں سمجھتا ہوں تاریخ ہے صرف اک تنازع خیر و شر
جو کہ بالواسطہ میرے اندر کے انساں سے منسوب ہے
جس کی بنیاد پر کل کی تاریخ لکھی گئی
جس کی بنیاد پر آج اور کل کی تاریخ کے باب روشن کئے جائیں گے
خیر و شر کے اسی معرکے کا نتیجہ تو ہے
کرب شام و سحر
نا امیدی و مایوسیاں
جو کہ میرے قبیلے سے موسوم ہیں،
اور مجھ کو یہ دکھ ہے
کہ میں بھی اسی زخم خوردہ قبیلے کا اک فرد ہوں۔

عزیز تمنائی

قصۂ درد

چاند نے مسکرا کر کہا
دوستو
قصۂ درد چھیڑے سرِ راہ کون؟
پھر بھی تارے مصر تھے
کہ ہم آج کی شب سنیں گے
وہی ان سنی داستاں
دیر تک چاند سوچا کیا
دور آفاق کی سمت دیکھا کیا
اور تاروں کی آنکھیں جھپکتی رہیں
رات کے دامنِ تر کو
آہستہ آہستہ
لمحوں کا ٹھنڈا لہو
جذب ہو ہو کے رنگین کرتا رہا

ناگہاں ایک نادیدہ زریں رقم
دستِ سیمیں بڑھا اور افق تا افق
ایک جنبش میں کھینچے ہزاروں کروڑوں طلائی خطوط
ڈوب کر رہ گئے شب کے سارے نقوط

چشمِ آفاق سے
اولیں قطرۂ درد ٹپکا
کسی برگِ نوخیز پر
عکسِ انجامِ رخسارِ آغاز پر۔

عکس

تم جو چاہو تو کسی نقطۂ لرزاں سے
کسی سمت چلو
اور کسی زاویۂ دیدۂ حیراں سے
کسی خط افق کو دیکھو
اور جو چاہو کسی مضراب سے
ہر ساز نہاں کو چھیڑو
ایک ہی دائرۂ حد نظر
ایک ہی زیر و بم نغمہ بانداز دگر
رگ احساس کو چھوتا ہوا لہراتا ہوا پاؤ گے
مثل آئینہ آفاق مسلسل حیراں
ایک ہی عکس سے ہر بار لپٹ جاؤ گے

عزیز قیسی

میں

میں جیتا ہوں آئینوں میں
آئینے جو غم خانے ہیں، میرے عکس بنا لیتے ہیں اپنی اپنی مرضی سے
میں جیتا ہوں کچھ سپنوں میں
سپنے آئینہ خانے ہیں، میرے نقش سجا بیٹھے ہیں اپنی اپنی مرضی سے
میں جیتا ہوں اس مٹی پر
جس کے گھر بنتے ہیں
جس سے بنتی ہیں قبریں
جس کا ذرہ ذرہ اوروں کا ہے
ان کا جن میں، میں ہوں جو مجھ میں ہیں
عکس کہا کرتے ہیں ــــ دیکھو تم ایسے ہو
نقش کہا کرتے ہیں ــــ ایسے بن سکتے ہو
ذرے کہتے ہیں ــــ تم ایسے بن جاؤ گے
تم بتلا سکتے ہو ــــ آخر میں کیسا ہوں
تم کیا بتلاؤ گے؟
تم خود آئینہ خانہ ہو، غم خانہ ہو، گھر ہو، قبر ہو،
تم خود "میں" ہو۔

علیم اللہ حالی

وعدہ

یہ کیسا عجیب اور طفلانہ وعدہ تھا
جب میں نے اک دوپہر
— گرم تپتی ہوئی دوپہر میں کہا تھا
کہ جب بھی میں راتوں کو سوؤں گا تو خواب میں
تجھ کو اور صرف تجھ کو ہی دیکھوں گا
جو تیرے علاوہ اگر اور کوئی خواب میں آ گئی تو
میں جھٹ اپنی خوابیدہ آنکھوں کے دروازے کھولوں گا
— اور نیند کے شہر سے بھاگ ہی جاؤں گا
جاگ ہی جاؤں گا
— مگر آج میں جاگتے میں کسی اور کو دیکھ کر
سخت الجھن میں ہوں، اور یہ
سوچتا ہوں میں اس وقت ہوتا
اگر خواب کے دیس میں تو معاً
اپنی خوابیدہ آنکھوں کے پٹ کھول کر
نیند کے شہر سے بھاگتا
تجھ سے ملتا — یہ کہتا
کہ میں اپنے اس خواب کے عہد پر
دیکھ لے آج تک ہوں اسی طرح قائم

عمیق حنفی

تعارف

میرا نام، مری صورت یا مری ذات، مری تصویر
ادھڑے پلستر والی ان دیواروں میں ہوں اسیر
فکر و ضمیر میری تقصیریں، فن میری تعزیر
خوابوں کا تاریک خرابہ ہے میری جاگیر

در در گھوم رہا ہوں لے کر آنکھوں کے کشکول
ہر منظر نے زہر ہلاہل ان میں دیا ہے گھول
خون جگر کی آمیزش سے زہر ہے آب حیات
آب حیات کی بوندیں ہیں یہ میرے کڑوے بول

تاریکی کے بیچ چھپائے ہے ہر چھوٹی بات

حسرت کے گلیاروں میں جب چھا جاتی ہے رات
خواہش کی قندیل جلاتی ہے میری تحریر
ترک تمنا کر کے دیکھا، اب خواہش تدبیر

کھیتی

وقت کی کھیتی ہیں ہم
وقت بوتا ہے، اگاتا، پالتا ہے
اور بڑھنے کے مواقع بھی ہمیں دیتا ہے وقت
سبز کو زریں بنانے کی اجازت مرحمت کرتا ہے، اور
ناچنے دیتا ہے باد شوخ کی موجوں کے ساتھ
جھومنے دیتا ہے سورج کی کرن کی ہم دمی میں
چاندنی پی کر ہمیں بدمست پاتا ہے تو خوش ہوتا ہے وقت
پھولنے پھلنے کی تدبیریں بتاتا ہے ہمیں
ہاں ــــ مگر انجام کار
کاٹ لیتا ہے ہمیں
ہم بالآخر اس کے نغمے
ہم بالآخر اس کی فصل

عمیق حنفی

مسیحا کی دوکان پر

اے مرے دورِ خرد کے ابنِ مریم
اے کہ تو ہے نفسِ امارہ کا نباضِ عظیم
یہ کتابیں، شیشیاں الماریاں
نلکیاں، نشتر، پیالے اور آلے
کوچ، آئینے، طلسمی شیشے، جادوئی چھڑیں
ہے بڑا مرعوب کن تیرا مطب
تو مری جیبوں کو حسرت سے نہ دیکھ
اک گماں آباد ہے تحت الثرائے لاشعور
تیرے سب نسخے مجھے معلوم ہیں
میز پر صحت کی مورت ہے مگر صحت نہیں
کچھ تصاویرِ بتاں ہیں بت نہیں
خواب آور گولیاں جو کھینچ دیں
چشمِ بینا پر فریبوں کی نقاب
شیشوں میں بند ہے ایسی شراب
جو شعور و ہوش کو دے تھپکیاں
تو نے رکھ چھوڑی ہے وہ افیون بھی

عمیق حنفی

سیر جو موہوم جنت کی کرائے
اور ایسے زہر ہیں آراستہ
جو مرے احساس غم کو ماردیں، غم کو نہیں

تو حقائق کا نہ میک اپ کر نہ ان کو مسخ کر
اور پھر تجویز کر نسخہ نیا
ورنہ اپنے یہ کھلونے، یہ بھلاوے یہ نشے
اس مطب ہی میں سجائے رکھ
نہ مجھ پر آزما

لاشعوری مرہموں سے مندمل ہو جائیں گے
زخم احساس و شعور؟
کیسے میں کرلوں یقیں!

(سندباد سے)

عمیق حنفی

واپسی

شام ہوئی
دن بھر کا تھکا ماندہ سورج
گھر لوٹتی بھیڑ کے کالے پیلے چہروں میں
یا بھورے غار میں ڈوب گیا
بجلی کے پیلے بلب ہوئے روشن
پورا چاند
دیکھ کے بپھری ہوئی مگر مدقوق روشنی کا طوفان
تنہائی کا کرب لئے
پردیسی کی مانند اکیلا دور کھڑا
اک آدھ مچلتی ہوئی نظر بھی کھینچ نہ پایا، تڑپ اٹھا
بجلی کے تیز اجالے میں
تاروں پہ دوڑتی روشنیوں کے جالے میں
مکڑی کے جالے میں الجھے جگنو سا
دم توڑ گیا
آکاش پہ اک پیلا سا دھبہ چھوڑ گیا

عمیق حنفی

شام ہوئی
ہر سو سڑکوں پر بھیڑ کا ساگر پھیل گیا
دریا میں فنا ہو جانے کی عشرت کے لئے
ہر قطرہ دریا برد ہوا۔

اس بھیڑ کے میلے ٹھیلے میں
آدم زادوں کے ریلے میں
کیا حسن و ادا کیا عشق و ہوس
کیا خواہش و شوق اور کیا حسرت
کیا شرم و حیا، جرأت، غیرت
ہر منظر بھیڑ میں ڈوب گیا

میں خود بھی خود میں ڈوب گیا
تنہا تنہا، تنہا تنہا

(شہرزاد سے)

فضل تابش

باتوں کی موت

جب بچے
بوڑھوں جیسی باتیں کرتے ہیں
تب دنیا
بے گنتی صدیوں کے کپڑے پہنے رہنے پر بھی
ننگی ہو جاتی ہے
بوڑھا ڈھلکا جسم لٹکتا صاف نظر آتا ہے

تب آوازیں
باتوں میں ڈھلنے کے بدلے
اونچی اور اونچی ہوتی ہیں
آوازیں چیخیں بنتی ہیں
باتیں چیخوں کی قبروں میں
کھو جاتی ہیں

فضل تابش

ارتقا

میں اب دو پاؤں پر چلنے لگا تھا
درختوں پہ لٹکتے پھل جو پہلے
بہت جھک کر بھی مجھ سے دور ہی تھے
وہی اب میرے کاندھوں پر رکھے تھے
مرے ہاتھوں کو فرصت مل گئی تھی
جو کل تک سخت پتھریلی زمیں پر
اجالے سے اندھیرا پھیلنے تک
بھٹکتے پھر رہے تھے
وہی اب اس کے نرم اور گرم چمکیلے بدن پر
رینگتے تھے
نرم ہوتے جا رہے تھے
نئی لذت پرانے سلسلے میں آ ملی تھی
مرے جبڑے جو بھاری اور لمبے، بے تکے تھے
انھیں اب بوجھ اٹھانے کی ضرورت کم سے کم تھی
وہ جبڑے اب سکڑتے جا رہے تھے
وہ بوسہ لے سکیں، اس راستے پر چل پڑے تھے
مگر بوسہ وہ پہلا گرم بوسہ
لٹکتے پھل یا اس کا جسم
پہلے کون اس منزل سے گذرا؟

فضیل جعفری

غزل

تیز آندھی، رات اندھیاری، اکیلا راہ رو
بڑھ رہا ہے سوچتا، ڈرتا، جھجکتا راہ رو

منزلیں سمتیں بدلتی جا رہی ہیں روز و شب
اس بھری دنیا میں ہے انسان تنہا راہ رو

کچھ تو ہے جو شہر میں پھرتا ہے گھبرایا ہوا
بے خطر ورنہ بھرے جنگل سے گزرا راہ رو

کھڑکیاں کھلنے لگیں، دروازے وا ہونے لگے
جب بھی گزرا راہ سے کوئی سجیلا راہ رو

خضر کی سی عمر ورنہ کیسے تنہا کاٹتے
بے سہارا راستوں کا ہیں سہارا راہ رو

بخش ہی دے کوئی شاید گیسوؤں کی نرم چھاؤں
ہر نئی بستی میں تھوڑی دیر ٹھہرا راہ رو

کوئی منزل آخری منزل نہیں ہوتی فضیل
زندگی بھی ہے مثالِ موجِ دریا راہ رو

فضیل جعفری

غزل

کوئی منزل ہو، مگر ساتھ رہی
زندگی ہے کہ سستی ساورتری

گھر سے باہر نہیں نکلا جاتا
روشنی یاد دلاتی ہے تری

میرے چہرے پہ ہے بکھری دیکھو
میرے اجداد کی مردہ مٹی

عشق میں خود کو سنبھالو، لوگو
بے خودی اور بھی لے ڈوبے گی

چاند بے جان ہے، بدصورت ہے
بات دیوانے کی سچ ہی نکلی

کچھ نہیں ہے تو، تجھے دیکھ کے کیوں
تیز ہو جاتی ہے دھڑکن دل کی

ہائے کس طرح سے پہنچیں تجھ تک
'میں' کی دیوار ہے ہم سے اونچی

لاکھ پاتال میں چھپ جاؤ فضیل
جسم کی چیخ سنائی دے گی

غزل

روز و شب چلتے ہیں لیکن نہیں پاتے خود کو
ہائے یہ دور، کہ اب اپنے ہی سائے ہوئے لوگ

کو بہ کو پھرتے ہیں بے نام بگولوں کی طرح
دل میں سو طرح کے ارمان بسائے ہوئے لوگ

راہ بھول گئے جسم کے صحراؤں میں
آرزوؤں کے سمندر میں نہائے ہوئے لوگ

سانپ سے رینگتے رہتے ہیں بدن میں شب روز
ہیں مگر عشق کو سینوں سے لگائے ہوئے لوگ

ہیں رواں جعفری کس شہر خزاں کی جانب
غم زدہ روحوں کے انبار اٹھائے ہوئے لوگ

قاضی سلیم

وائرس

ابھی ابھی تو لب سے ملے تھے کتنے پیار سے
زباں پہ یہ کسیلا پن کہاں سے آگیا
مسیح وقت تم بتاؤ کیا ہوا
ذرا سی دیر کے لئے پلک جھپک گئی
تو راکھ کس طرح جھڑی

سنا ہے دور دیس سے
کچھ ایسے وائرس ہمارے ساحلوں پہ آگئے
جن کے تاب کارسحر کے لئے
امرت اور زہر ایک ہیں
اب کسی کے درمیاں کوئی رابطہ نہیں
کسی دوا کا درد سے کوئی واسطہ نہیں

ہم ہوا کی موج موج سے
درد کھینچتے ہیں چھوڑتے ہیں سانس کی طرح

قاضی سلیم

لہو کی ایک ایک بوند زخم بن گئی
رگوں میں جیسے بددعائیں تیرتی ہیں پھانس کی طرح

مسیح وقت تم بتاؤ کیا ہوا
دیو علم کے چراغ کا
کیوں بھلا بھبھر گیا
دھواں دھواں بکھر گیا،

سنو کہ چیختا ہے ——
"کام ———— کوئی کام"

کچھ نہیں
جاؤ ساحلوں کی سمت ہوسکے تو روک لو
اس نئے عذاب کو
یا کروڑوں سال کے لئے
خدا کی آخری شکست تک
سمندروں کی ریت پھانکتے رہو۔

قاضی سلیم

دفت

ایک،

پھر دوسری،

پھر تیسری،

اور اب تو پیہم

گڑگڑاہٹ کی مسلسل چوٹیں،

میرے اعصاب پہ پڑنے لگیں

تب ریل کی رفتار بڑھی،

بھاگتے پیڑ

-چٹانیں

-کھمبے

پاس سے گزرے تو آواز ملا کر چیخے

شور ہی شور ہے

یہ شور مگر

اپنا اظہار ہے اثبات ہے ہر شے کے لئے

قاضی سلیم

آسماں سرخ ہے
اب بھی وہ ستارا تنہا
نگراں ہے مرے ہر کرب کا
یہ کہتا ہے
"عمر اک چیخ کی میعاد ہے
تم بھی چیخو ——
اتنی شدت سے کہ اک مدت تک
وقت کو یاد رہے
جنگلوں اور پہاڑوں میں یہ فریاد رہے"

آہنی پہیوں نے، فولادی زباں میں اپنی
بات دہرائی، یہ آواز تھی جانی بوجھی
ایسے مانوس تھے الفاظ جنھیں عمر تمام
سنتے رہتے ہیں مگر سیکھ نہیں پاتے ہیں
آج بھی دیر تلک سنتا رہا
ثانیے،
ساعتیں،
شام اور سحر،

قاضی سلیم

منزلیں کٹتی رہیں — وقت چلا
دھیرے دھیرے میری رگ رگ میں لہو کی گردش
دور و نزدیک کی بے درد کشاکش سے ملی
گھڑ گھڑاہٹ سے ہم آہنگ ہوئی
اب ہوں میں جزو اسی کا شاید
آہنی پہیہ ہوں، اک ایسا تسلسل ہوں
کہ جس کے کوئی معنی ہی نہیں

پچھلی ضربات سے ہر ضرب نئی
ایسے مل جاتی ہے جیسے اس میں
کسی احساس کا فریاد کا وقفہ بھی نہیں۔

قاضی سلیم

بے نظر میری آنکھیں

بے نظر میری آنکھیں
رات کی ان چٹانوں میں پیوست ہیں
جن کے ہر اک پرت میں
جنتیں اور جہنم سبھی منجمد ہو گئے ہیں

....

چاند کے سارے قاتل
اپنے مقتول کی گود میں
منہ چھپائے ہوئے سو گئے ہیں

....

اب بھلا کس کو الزام دیں ـــ!

....

ہر پرت ایک یگ کی کہانی ہے
جو نیک و بد کی حدوں سے پرے
دائرے دائرے گھومتی خود بھنور بن گئی ہے

....

قاضی سلیم

ابھی کچھ دیر پہلے مرے سامنے
وقت کا تیز لاوا بہا
بے سبب جم گیا
سرد اور گرم گدلا دھواں
مرغولے کھاتا رہا
آگ اور راکھ کے درمیاں
نارسا ذہن بے سوچ چلتا رہا
بے سبب تھم گیا

....

کون ظالم تھا ــــ ؟
اور کون مظلوم تھا ــــ !!
کیا میرے ساتھی جہنم زدہ تھے
دیکھنے کو چلے تھے ــــــ
کوکھ دھرتی کی چیریں تو کیا ہو
بیج میں باپ کا رنگ اور روپ کتنا بچا ہے
پیار کا دیوتا جسم کے کون سے عضو میں زخم بن کر چھپا ہے
اور محبوب کے خون میں ــــــ
کن رقیبوں کی پرچھائیاں ہیں

آہنی میز پر

کلبلاتے ہوئے نلکی زادوں کو
ـــ اب کون وارث بناتا، کہ وہ تو خدا کے
اپنے بیٹے تھے، مصلوب ہونے کی خاطر ہی پیدا ہوئے تھے

....

وقت کو تھامنے کی سکت ان میں باقی نہ تھی
تیز دوڑاتے پھرنے کا کچھ حوصلہ تھا
تیز دوڑاتے پھرتے تھے دیوانہ وار
ننگی پیٹھوں پہ برقائے بے درد کوڑے برستے رہے
دوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا
دوڑتے دوڑتے تھک گئے

....

اے خدا میرے ساتھی تو معصوم تھے
تیرے بیٹے تھے
شیطنت کا یہ عرفان کیوں کر ہوا
تیرے سب جھوٹ سچے ہیں
ــــــ سچائی خود اک بڑی عمر کا جھوٹ ہے

....

سال ہا سال سے ہے مقدر ہمارا یہی تیرگی
سرد اور گرم گدلا دھواں

قاضی سلیم

صورتیں ——— عکس

جسم ——— پرچھائیاں

....

اجنبی ——— اجنبی

وقت یوں بہہ رہا ہے کہ جیسے یہاں کوئی زندہ نہیں

جیسے اس قطعہ ارض کا حشر ہو بھی چکا

جان داروں کے پنجر، سبھی کھو گئے

حسن بے جسم ہے

انگلیاں ہڈیوں کی سطح کھوجتی کھوجتی تھک گئیں

جیسے برگد کی پارنیاں

قطرۂ آب کی آس میں

سوکھی بنجر زمیں کی طرف بڑھ رہی ہوں

....

بے نظر میری آنکھیں

رات کی ان چٹانوں میں پیوست ہیں۔

قمر اقبال

المیہ

کل جو نکلے تھے گھر سے سفر کے لئے ظلمتوں میں گھری تھی ہر اک رہ گزر
ظلمتیں راہ تکتی تھیں ہر موڑ پر
ظلمتیں زاد رہ ظلمتیں ہم سفر
ظلمتیں اور وہ بھی گھنی اس قدر
کیا ہے اطراف کچھ سوجھتا ہی نہ تھا
ہم کو اپنے پس و پیش کا کچھ پتہ ہی نہ تھا
اب جو نکلے ہیں گھر سے سفر کے لئے روشنی میں گھری ہے ہر اک رہ گزر
روشنی راہ تکتی ہے ہر موڑ پر
روشنی زاد رہ روشنی ہم سفر
روشنی اور وہ بھی گھنی اس قدر
جیسے سرتا بہ پا روشنی بن گئے
چار سو روشنی ـــــ بے کراں روشنی
یہ زمیں روشنی ـــــ آسماں روشنی
دونوں آنکھوں کی ہیں پتلیاں روشنی
روشنی اس قدر ہے کہ نظروں کو کچھ سوجھتا ہی نہیں
ہم کو اپنے پس و پیش کا کچھ پتہ ہی نہیں

میں اور تو

سرخ رنگ کے ڈبے میں
جو کچھ بھی تھا
وہ تو تیری انگلی میں ہے
لیکن
تیرے دل کے ویرانے میں
اک دن
جو ننھا سا پھول کھلا تھا
وہ اب تیرے پاس کہاں؟؟

تیرا نام

دوپہر کی دھول نے
میری اجڑی میز پر
تیرا نام لکھا ہے

کفیل آذر

غزل

گھٹاؤں کی اداسی پی رہا ہوں
میں اک گہرا سمندر بن گیا ہوں

تری یادوں کے انگاروں کو اکثر
تصور کے لبوں سے چومتا ہوں

کوئی پہچاننے والا نہیں ہے
بھرے بازار میں تنہا کھڑا ہوں

مرا قد کتنا اونچا ہو گیا ہے
فلک کی وسعتوں کو ناپتا ہوں

وہ یوں مجھ کو بھلانا چاہتے ہیں
کہ جیسے میں بھی کوئی حادثہ ہوں

بدلتے موسموں کی ڈائری سے
ترے بارے میں اکثر پوچھتا ہوں

مرے کمرے میں یادیں سو رہی ہیں
میں سڑکوں پر بھٹکتا پھر رہا ہوں

ابھرتے ڈوبتے سورج کا منظر
بسوں کی کھڑکیوں سے دیکھتا ہوں

کسی کی یاد کے پتوں کو آذر
ہواؤں سے بچا کر رکھ رہا ہوں

کمار پاشی

کبھی تم جو لوٹو

کسی دن سمندر سے لوٹو: تو آواز دینا
کہ ہم نے
تمھارے سفر کی کہانی لکھی تھی
وہ شاید ہمیں تھے۔ ہمیں آکے پہچان لینا
جنھوں نے کبھی پتھروں پر
کبھی خشک پتوں، کبھی ریت پر
داستانیں لکھی تھیں
یہ سچ ہے کہ ہم تھک چکے تھے
ہمارے دماغوں میں اک ابتری تھی
تمھاری کہانی میں کیا رنگ بھرتے: ہم تھک چکے تھے
ہمیں صرف اس کے نہ ہونے کا غم تھا
کہ جو مر چکا تھا
تمھیں موسموں نے جو عریاں کیا
اور تمھیں بے کراں پانیوں کے سفر میں جو ذلت ملی
اس کا باعث ہمیں تھے
کسی دن سمندر سے لوٹو۔۔۔ تو آنا
ہمیں آکے پہچان لینا

کمار پاشی

گذشتہ دنوں کا قصہ

وہ شہروں سے آئے تھے
تہذیب سے آشنا تھے
نفاست سے رہنا انھوں نے ہی ہم کو سکھایا تھا
ایسا کتابوں میں، میں نے پڑھا ہے
وہ نعرے لگاتے ہوئے چل رہے تھے
فلک بوس نعرے
مگر ہم نے (جو دور جاتی ہوئی، چوڑی سڑکوں کے دونوں طرف ہاتھ باندھے
کھڑے تھے) کہا:
یہ بجا ہے، ہمارے بزرگوں کو تم نے
نفاست سے رہنا سکھایا تھا
لیکن
ہماری تمھاری زبانیں جدا ہیں
ہماری زباں میں بھی اک آدھ نعرہ لگاؤ
تبھی ہم
تمھارے سفر کی مہورت کا الزام لیں گے

۲

یہ سن کر انھوں نے

کمار پاشی

ہماری زباں میں بھی دو چار نعرے لگائے
تو ہم سب
جواباً بڑی دیر تک مسکرائے
اسی رات ہم نے
کھلے آسمانوں تلے
ان کا سواگت کیا
ان کے سینوں پہ جگ مگ ستاروں کے تمغے لگائے
اور ان کی وجے کا
سبھی دیوتاؤں سے وردان مانگا
گئی رات تک
یہ حسیں جشن جاری رہا
چندر ماؤں کے پیالوں میں ہم نے انھیں
جو کی مے پیش کی
جس کو پہلے پہل وہ جھجکتے ہوئے
پھر مچلتے ہوئے
پھر فلک بوس نعرے لگاتے ہوئے
مل کے پینے لگے
تب ہمارے بزرگوں کے وقتوں کے سازندوں نے
ساز اپنے اٹھائے

کماریاشی

خلاؤں میں نغموں کے جگنو ہنسے
رات اپنی لٹیں کھول کر رقص کرنے لگی
اور بڑی دیر تک
وہ ہماری حسیں بیویوں کے
تھرکتے نتمبوں
دھڑکتے ارو جوں
کا گن گان کرتے رہے
پھر ہماری کنواری، جواں بیٹیوں کو
بغل میں لئے
دور پھیلے ہوئے سایوں میں کھو گئے

۳

(اور) وہ شاید دسمبر کا اک سرد دن تھا
کہ جب ہم نے کپڑے اتارے
بدن پر سیاہی ملی
اور ہاتھوں میں اپنی لکھی سب کتابیں اٹھائے
ہزاروں کی تعداد میں گھر سے نکلے
تو سڑکوں پہ چلتی ہوئی موٹروں میں بسوں میں
سے گنتے ہی لوگوں نے فقرے اچھالے
مگر ہم .... کہ شرمندگی اپنا تعویذ تھا، بازوؤں پر سجائے

کمار پاشی

افق کے اشارے پہ گھر چھوڑ کر
ان پہاڑوں پہ پہنچے
جہاں ہم نے مل کر خود اپنی لکھی سب کتابیں جلادیں۔
ہزاروں برس بعد
شہروں میں آئے
تو لوگوں نے ہم کو بتایا:
حکومت ہماری ہے
ہم سارے مکتب تمھیں سونپتے ہیں
تمھیں پھر سے بچوں کو تعلیم دینا پڑے گی
مگر ایک دن
ہم نے سپنے میں دیکھا
ہماری کنواری جواں بیٹیوں نے
جو بچے جنے تھے
وہ اب اپنے ہاتھوں میں ترشول لے کر
ہماری ہی جانب چلے آرہے ہیں
تو شاید انھوں نے
ہماری نئی بیٹیوں (اپنی بہنوں) کے جسموں کی بو سونگھ لی ہے۔

ایم کوٹھیاوی راہی

ایک فن کار کی وصیت

ذرا میری کاپی اٹھاؤ کہ میں آخری سانس لینے سے پہلے
وصیت تو لکھ دوں!
"مرے بعد
دنیا سے فریاد ہے کہ وہ بچوں کو میرے
مرنے سا تھ ہی دفن کر دے
نہیں تو
یہ بچے مرے ایک دن اس کو تباہ کر دیں گے
صدیوں سے مل کے،
یہ بچے مرے
کالے کالے سے بچے
جو کاپی کے صفحات پر سو رہے ہیں!"

فاصلہ

یاس کی لہریں
اک سفینہ سا بہتا چلا آ رہا ہے
کون جانے یہ کس کا سفینہ ہے،
مانجھی ہے کون اس کا،
کوئی بھی ہو آؤ ہم تم اسی پر چلیں
کیا عجب کوئی لمحہ اسی کے مقدر کو ساحل ملے
کیا عجب ہم اسی کے سہارے کنارے سے
لگ جائیں
سوچو
ورنہ بحرِ فنا گود پھیلا چکا ہے
اور ہم سخت خطرے میں ہیں
تڑ چکا ہے یہ تختہ بھی اے یاس کی لہر کے ہم سفرو
ڈوب جانے دو اس کو،
اور ہم یاس کی لہر کے اس سفینے میں جب آ گئے تو
یہ ہم پر کھلا
یاس اور آس میں فاصلہ کچھ نہیں

کیف احمد صدیقی

غزل

وقت لاکھوں حادثات ناگہاں لکھتا رہا
پھر بھی دل کی ڈائری کا ہر ورق سادہ رہا

رات میرے ذہن میں کیا جانے کیا الجھن رہی
دیر تک میں سگرٹوں پر سگرٹیں پیتا رہا

مرگِ دل، مرگِ محبت اور مرگِ آرزو
اتنی موتیں دیکھ کر میں کس طرح زندہ رہا

آفتابِ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں
میں برہنہ پا تلاشِ مرگ میں پھرتا رہا

اک محل کی چاندنی بے تاب تھی میرے لئے
میں اندھیری رات میں فٹ پاتھ پر لیٹا رہا

سب نے تو تعمیر کر ڈالے حقیقت کے محل
اور میں خوابوں کی اک دیوار ہی چنتا رہا

کیفؔ یہ فکرِ سخن وہ جان لیوا شوق ہے
قطرہ قطرہ خونِ دل پی کر بھی جو پیاسا رہا

مدحت الاختر

غزل

کانٹوں کا تاج اپنی جبیں پر سجایئے
ہے زندگی سے پیار تو مر کر دکھایئے

پربت پہ جا کے تان اڑانے سے فائدہ!
بستی میں آ کے گیت کا جادو جگایئے

نغمے چھڑے ہوئے ہیں کوئی آہ کیا سنے
محفل جمی ہے عرض طلب کو نہ جایئے

تاروں کی چھاؤں میں تو بہت دیر سو چکے
سورج کی روشنی میں ذرا جاگ جایئے

خود چل کے کیوں نہ ان سے ملاقات کیجئے
مدحت کسی کی راہ میں کیوں بیٹھ جایئے

محمد علوی

غزل

روشنی کچھ تو ملے جنگل میں
آگ لگ جائے گھنے جنگل میں

آپ کو شہر میں ڈر لگتا ہے
ہم تو بے خوف رہے جنگل میں

ایک اک شاخ زباں ہو جائے
کوئی آواز تو دے جنگل میں

پیڑ سے پیڑ لگا رہتا ہے
پیار ہوتا ہے بھرے جنگل میں

شہر میں کان ترستے ہی رہے
چہچہے ہم نے سنے جنگل میں

شام ہوتے ہی اتر آتے ہیں
شوخ پریوں کے پرے جنگل میں

شوخ ہرنوں نے قلانچیں ماریں
مور کے رقص ہوئے جنگل میں

اب بھی قدموں کے نشاں ملتے ہیں
گاؤں سے دور پرے جنگل میں

اب بھی پھرتی ہے کوئی پرچھائیں
رات کے وقت بھرے جنگل میں

محمد علوی

ایک نظم

کچھ دیر کھیلے گی
پھر توڑ دے گی
مجھے سب پتا ہے
مگر پھر بھی میں
نیند کے ہاتھ میں
خواب دیتا رہوں گا

غزل

سوچتے رہتے ہیں اکثر رات میں
ڈوب کیوں جاتے ہیں منظر رات میں

کس نے لہرائی ہیں زلفیں دور تک
کون پھرتا ہے کھلے سر رات میں

چاندنی پی کر بہک جاتی ہے رات
چاند بن جاتا ہے ساغر رات میں

چوم لیتے ہیں کناروں کی حدیں
جھوم اٹھتے ہیں سمندر رات میں

کھڑکیوں سے جھانکتی ہے روشنی
بتیاں جلتی ہیں گھر گھر رات میں

رات کا ہم پر بڑا احسان ہے
رو لیا کرتے ہیں کھل کر رات میں

دل کا پہلو میں گماں ہوتا نہیں
آنکھ بن جاتی ہے پتھر رات میں

علوی صاحب وقت ہے آرام کا
سو رہو سب کچھ بھلا کر رات میں

محمد علوی

آخری دن کی تلاش

خدا نے قرآن میں کہا ہے
کہ لوگو میں نے
تمھاری خاطر فلک بنایا
فلک کو تاروں سے
چاند، سورج سے جگمگایا
کہ لوگو میں نے
تمھاری خاطر زمیں بنائی
زمیں کے سینے پہ
ندیوں کی لکیریں کھینچیں
سمندروں کو
زمیں کی آغوش میں بٹھایا
پہاڑ رکھے
درخت اگائے
درخت پہ پھول، پھل لگائے
کہ لوگو میں نے
تمھاری خاطر یہ دن بنایا
کہ دن میں سب کام کرسکو تم
کہ لوگو میں نے
تمھاری خاطر یہ شب بنائی
کہ شب میں آرام کرسکو تم
کہ لوگو میں نے
تمھاری خاطر یہ سب بنایا
مگر نہ بھولو
کہ ایک دن میں
یہ ساری چیزیں سمیٹ لوں گا!
خدا نے جو کچھ کہا ہے
سچ ہے
مگر نہ جانے
وہ دن کہاں ہے؟!
وہ آخری دن
کہ جب خدا یہ تمام چیزیں سمیٹ لے گا
مجھے اسی دن کی جستجو ہے
کہ اب یہ چیزیں
بہت پرانی
بہت ہی فرسودہ ہو چکی ہیں!!

محمد علوی

غزل

آیا ہے ایک شخص عجب آن بان کا
نقشہ بدل گیا ہے پرانے مکان کا

تارے سے ٹوٹتے ہیں ابھی تک ادھر ادھر
باقی ہے کچھ نشہ ابھی کل کی اڑان کا

کالک سی جم رہی ہے چمکتی زمین پر
سورج سے جل اٹھا ہے ورق آسمان کا

دریا میں دور دور تلک کشتیاں نہ تھیں
خطرہ نہ تھا ہوا کو کسی بادبان کا

دونوں کے دل میں خوف تھا میدان جنگ میں
دونوں کا خوف، فاصلہ تھا درمیان کا

علوی کو اڑ کھول کے دیکھا تو کچھ نہ تھا!
وہ تو قصور تھا مرے وہم و گمان کا

محمود ایاز

اسپتال کا کمرہ

تمام شب کی گھٹن بےکلی سبک خوابی
نمودِ صبح کو درماں سمجھ کے کاٹی ہے
رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کی گھبراہٹ
اجل گرفتہ خیالوں کو آس دیتی ہے
مگر وہ آنکھ جو سب دیکھتی ہے
ہنستی ہے!

افق سے صبح کی پہلی کرن ابھرتی ہے
تمام رات کی فریاد اک سکوت میں چپ
تمام شب کی گھٹن بےکلی سبک خوابی
حریری پردوں کی خاموش سلوٹوں میں گم
جو آنکھ زندہ تھی خاموش چھت کو تکتی ہے
مگر وہ آنکھ جو سب دیکھتی ہے
ہنستی ہے!

نمودِ صبح کی زرتار روشنی کے ساتھ
مہکتے پھول دریچے سے جھانکتے دیکھیں
تو میز و در پہ کسی درد کا نشاں نہ ملے
اگال دان دواؤں کی شیشیاں پنکھا
کنواری ماں کا تبسم صلیب آویزاں
ہر ایک چیز بدستور اپنی اپنی جگہ
نئے مریض کی آمد کا انتظار کرے
اور ایک آنکھ جو سب دیکھتی ہے
ہنستی رہے!

محمود ایاز

نوحہ

سیہ رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
خمِ قاتل سمندر کی موجیں تجھے ڈھونڈتی ہیں
غروشاں ہوا کی صداؤں میں تیری صدا ہے
مرا دل تجھے ڈھونڈتا ہے

سیہ رات اشکوں کی شبنم میں سوئی ہوئی ہے
ہر اک پل ہر اک لمحہ ماضی کا زندہ ہے موجود میں جاگتا ہے
مگر تیرا پیکر۔
تہ خاک اندھیروں کے دامن میں سویا ہوا ہے
مرا دل کہ ماتم گر رفتگاں ہے تجھے ڈھونڈتا ہے

میں آسودۂ ریگ خاموش اس رات کی جلتی آنکھوں کو دیکھوں
سیہ رات میں ٹمٹماتے ہوئے ان ستاروں سے پوچھوں
خروشاں سمندر میں ڈوبا ہوا چاند
کسی اجنبی سرزمیں پر تبسم کناں ہے
نقوش کفِ پا کی منزل کہاں ہے؟

محمود ایاز

یم زندگی سیل در سیل بہتا ہوا
ایک لمحے کو رک کر پلٹ کر نہ دیکھے
سیہ رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
فقط ایک شب، بے صدا جاگتی ہے
شب بے صدا پوچھتی ہے
بپھرتی ہوئی موج دریا کدھر سے چلی تھی؟
کدھر کو چلی ہے؟
مرا دل کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے
کسے ڈھونڈھتا ہے —!!

تاریک جزیرہ

دن کی نگری سے پرے، شام کی بستی کے قریں
اک جزیرہ ہے — پراسرار، خموش اور اداس
بے کراں دھند میں لپٹا ہوا، ڈوبا ہوا تاریکی میں
دم بہ خود، مہر بہ لب، سرد فضائیں جس کی
خامشی میں کچھ اشارے سے کیا کرتی ہیں
تیرگی میں کئی شمعیں سی جلا کرتی ہیں
میں کہ اک رہ رو درماندہ ہوں
جسے دن بھر کی مسافت نے تھکا مارا ہے
صبح، سورج مرے ہم راہ چلا تھا، اور اب
اس کے چہرے پہ بھی ایسی ہی تھکن چھائی ہے
روشنی اس کے تبسم کی بھی سنولائی ہے
دم بہ دم پھیلتی، بڑھتی ہوئی تاریکی میں
سوچتا ہوں کہ سفر ختم ہوا
وقت کے تیرہ و تاریک اندھیرے پتھ پر
میں اکیلا تو نہ دو گام بھی چل پاؤں گا
ٹھوکریں کھاؤں گا، درماندہ ہوں، گر جاؤں گا
— یہ جزیرہ ہی مری آخری منزل ہوگا

نور سعید

ایک پرانا شہر

مہر بہ لب سنسان دریچے، دروازے ویران
دور پہاڑوں کی چوٹی پر، شاہی گورستان
نیم کی شاخوں میں الجھی ہے کنکوے کی کانپ
دیواروں پر رینگ رہا ہے خستگی کا سانپ
سڑکیں رہ گیروں پر ڈالیں، ٹھنڈی سرد نگاہ
شرم عریانی سے چپ ہے بوڑھی شہر پناہ

وقت کے قدموں کی آہٹ دیتی ہے سنائی، ایسے
سناٹے میں بھٹک رہی ہوں بیتی صدیاں جیسے
اک اک لمحہ ڈھونڈھ رہا ہے کھوئی ہوئی رعنائی
دوڑ رہا ہے پیچھے کو با وصف شکستہ پائی
راہ میں لیکن کچھ دیواریں آن کھڑی ہوئی ہیں
دیواریں، جن پر ننگی شمشیریں گڑی ہوئی ہیں
ان سے سر ٹکراتے لمحوں کے یہ پگلے سائے
مملکت فردا کا رستہ کون انھیں دکھلائے؟

مشتاق علی شاہد

شہر تباہ

اونچی دیواریں گریں
شہتیر جھکے
چھت ٹوٹی
موم کے شہر میں
سورج اترا ۔۔۔۔ !

پچھلے پہر
فتح و شجاعت کا نشاں
شہر کا آخری بت بھی ٹوٹا ۔۔۔۔

بے خبر سوئی ہیں
ٹھنڈی لاشیں !!

پیاس بجھی تو ۔۔۔

جب سے میری پیاس بجھی ہے
مجھ کو پل بھر چین نہیں ہے ۔۔۔۔
میری پیاس بجھانے والا
میرے لہو کو
جانے کیسی طغیانی سی بخش گیا ہے
میری لمبی لمبی باہیں،
سرکش باہیں ۔۔۔۔
سوکھ ہی جائیں تو اچھا ہے !
سورج کی نوکیلی کرنو
آؤ
میری کوکھ کا سارا جل پی جاؤ
ورنہ میں رن چنڈی بن کر
بستی، بستی ٹوٹ پڑوں گی ۔۔۔۔ !

مصحف اقبال توصیفی

فائزا[1]

کبھی پتھروں کے ذخیرے سے خاکستری رنگ کا
ایک پتھر اٹھایا ہے
اور اس میں تاریخ کے ابتدائی زمانے کا اک جانور
'فائزا' دیکھ کر
سوچتا رہ گیا ہوں
کہ یہ جانور آج تک ایک پتھر سے چمٹا ہوا ہے
اسی ایک پتھر میں یہ دفن ہے

کبھی ایسا لگتا ہے جیسے
مرا جسم بھی ابتدائی زمانے کا پتھر ہے کوئی
وہ پتھر کہ جس میں مری روح سمٹی ہوئی ہے
مری روح میں 'فائزا' ہے۔

[1] Fossil

مصحف اقبال توصیفی

سفید پوش

وہ آرہا ہے

وہ اقلیدسی شکل اس کی، مثلث نما ہونٹ
لہجے کی مخصوص گمبھیرتا
وہی جانے پہچانے مانوس فقرے
ابھی مرے شانے پہ وہ ہات رکھ کر کہے گا
"بھئی ــــ اتنے دن سے کہاں تھے
کہیں بیٹھ کر آؤ کچھ دیر باتیں کریں
ــــ پئیں
کوالٹی بار، پرسنز
چلیں؟"

"مداری!
پٹارے میں کیا ہے؟
وہی، بین، سانپ، ــــ اور کوئی تماشہ؟!!..."

مظفر حنفی

غزل

ظلمت میں تری یاد کا زینہ نکل آیا
اک مصرفِ اوقاتِ شبینہ نکل آیا

ہر چند کہ محفل نے مری قدر بہت کی
اکتا کے انگوٹھی سے نگینہ نکل آیا

پھر کوہ کنی ڈھال رہی ہے نئے تیشے
پھر فخر سے چٹان کا سینہ نکل آیا

سچ مچ وہ تغافل سے کنارا ہی کرے
میں سوچنے بیٹھا تو پسینہ نکل آیا

غوطہ بھی لگایا ہے تو مایوس ہوا ہوں
ہر موج کے دامن میں سفینہ نکل آیا

گھبرایا ہوا دیکھ کے پت جھڑ کے عقب سے
میرے لئے ساون کا مہینہ نکل آیا

جب وقت نے چھاپی ہیں مظفر کی بیاضیں
ہر شعر میں ندرت کا سفینہ نکل آیا

خوف در خوف

سرد ہواؤں نے پر تولے،
جھینگر چپکی مکی بولے —
الو چیخا —
"ہاؤں"
کالی بلی.....
"میاؤں"
کتوں نے ملہار الاپا ویرانے میں،
"رات پھنسی ہے مکڑی کے تانے بانے میں"
خوف نے
ڈرتے ڈرتے جوں ہی دل میں کروٹ لی،
سناٹا بولا —
"شی!!!"

ناہید ثانی

ریگ زار میں

مجھے ریگ زاروں سے باہر نکالو
مجھے ریگ زاروں سے باہر نکلنے کا کوئی وسیلہ بتاؤ
مری آنکھ ذروں کی تابندگی کے دہکتے ہوئے راز کو پا چکی ہے
مری آنکھ اب خودکشی کی طلب میں
نگاہوں کے تاریک ساحل تلک آ چکی ہے
مرے پاؤں ذروں کے بپھرے ہوئے رقص کو ختم کرنے کی سب کوششیں کر چکے ہیں
میں ساکت ہوا جا رہا ہوں
مرے پاؤں سورج کے ٹوٹے عناصر کو
ریشم صفت، گرم ذرات میں دفن کرنے کا ہر اک جتن کر چکے ہیں
میں تاریکیوں کے ہزاروں پہاڑوں کے نیچے
سسکتی نظر کا ہر اک جور سہتا رہا ہوں
مجھے ریگ زاروں میں بکھرے ہوئے
شعلہ بردوش عفریت، اپنا نوالہ بنانے کے درپے ہیں،
یوں گھورتے ہیں

کہ جیسے
سمندر کے طوفاں میں مٹتے جزیروں کی اندوہ ناکی
مرے نیک، مجبور اعمال ہی کا سبب ہے

مجھے ان بلاؤں سے محفوظ رہنے کی صورت بتا دو
مجھے ان دہکتے ہوئے ریگ زاروں سے باہر نکالو
مری آنکھ ـــــ اب خودکشی کر رہی ہے
مجھے ریگ زاروں کے عفریت ڈسنے لگے ہیں
میں تنہا، ہراساں ہوں، مجبور، بے کس ہوں مجھ کو
سلگتی ہوئی ریت
غول بیاباں کی صورت مچلتے ہوئے ان خنازیر کے بدارادوں سے
بچنے کی صورت بتا دو

مرا جسم
تپتے ہوئے ریگ زاروں میں
سرما کی ٹھٹھری ہوئی اک لہر بن گیا ہے
مجھے ان مقدس شراروں کے آتش کدے میں گرا دو
جہاں اب سے پہلے
ٹھٹھرتے ہوئے، یخ زدہ، سرد جسموں کو
اک بار پھر سے جواں زندگی کی امانت ملی تھی۔

ندا فاضلی

اظہار

شام ہونے کو ہے — !
پیلی دھوپ
چھجے سے اتر کر
اون کے گولے سی بستر پہ پڑی ہے
رنگ میں ڈوبی دشائیں
پتیوں میں سرسراتی اپسرائیں
تم نہیں ہو
چاہتا ہوں اس گھڑی جو ذہن میں ہے نظم کر دوں
شبد سارے شبد
کتنے اجنبی — کتنے اجانے !!
کانچ کی پیالی کو چکنا چور کر دوں
سب کتابوں پر نئے کاغذ چڑھا دوں
نیم کی ڈالی سے چڑیا کو اڑا دوں
یا کسی بچے کو گودی میں اٹھا کر
راستے سے بولتی گڑیا دلا دوں
ریشمی تلووں کو منہ سے گدگدا دوں
شبد سارے شبد
کتنے اجنبی !
کتنے اجانے !

بے خواب نیند

نہ جانے کون وہ بہروپیا ہے
جو ہر شب ــــ
مری تھکی ہوئی پلکوں کی سبز چھاؤں میں
طرح طرح کے کرشمے دکھایا کرتا ہے!
لپکتی سرخ لپٹ ــــ
جھومتی ہوئی ڈالی ــ
چمکتے تال کے پانی میں ڈوبتا پتھر!
ابھرتے پھیلتے گھیروں میں تیرتے خنجر!
اچھلتی گیند ربڑ کی۔
سدھے ہوئے دو ہاتھ
سلگتے کھیت کی مٹی پہ ٹوٹتی برسات
عجیب خواب ہیں یہ!!
بنا وضو کیے سوئی نہیں کبھی میں تو۔
میں چاہتی ہوں ــــ
کسی روز اپنی بھابی کے
چھنکتے پاؤں کی پازیب توڑ کر رکھ دوں
بڑی شریر ہے ہر وقت شور کرتی ہے ــــ
کسی طرح سہی، بے خواب نیند تو آئے
گھڑی گھڑی کی مصیبت سے جان چھٹ جائے۔

ندا فاضلی

ایک بات

اس نے !
اپنا پیر کھجایا
انگوٹھی کے نگ کو دیکھا
اٹھ کر خالی جگ کو دیکھا
آنچل سے اک ٹانکا توڑا
'چرپائی' کا بان مروڑا
بھرے پرے گھر کے آنگن میں
کبھی کبھی اک بات
جو لب تک ـــــ
آتے آتے کھو جاتی ہے
کتنی سندر ہو جاتی ہے !!

نقابیں

نیلی، پیلی، ہری، گلابی
میں نے سب
رنگین نقابیں
اپنی جیبوں میں بھر لی ہیں
اب میرا چہرہ ننگا ہے
بالکل ننگا
اب میرے ساتھی ہی مجھ پر
پگ پگ
پتھر پھینک رہے ہیں
شاید وہ
میرے چہرے میں اپنے چہرے دیکھ رہے ہیں

وحید اختر

ز کنار ما بہ کنار ما

زباں بریدہ نظر بند دست و پا بستہ
ہجوم عام سر رہ گذار ہے حیراں
گرسنگیٔ شکم تشنگیٔ دیدۂ و دل
ندیدہ چشمۂ حیواں کی فکر میں غلطاں
شمار سبحۂ انفاس و دھڑکنوں کا حساب
کچھ ایسا پھیر کہ حاصل ہے بس زیاں ہی زیاں
ہر ایک ہاتھ میں اعمال نامۂ یک عمر
مگر نہ داور محشر نہ عدل کی میزاں
ہر ایک آئینہ در دست خود نما خود بیں
مگر کسی کو کسی کا پتہ نہ اپنا نشاں

ہے ایک عرصۂ عبرت یہ عالم برزخ
نہ زندگی ہے رفیق اور نہ موت ہے پرساں
میں اس ہجوم میں کس سے کروں سوال نظر
کسی کا دے گی پتہ کیا یہ بزم گم شدگاں
ہے کون کان دھرے جو صراط کے پل پر
مجھے یہ ڈر ہے اکارت نہ جائے میری فغاں
میں اپنے زخم دکھاؤں مگر ہے یہ بھی یقیں
یہ لوگ بھی تو ہیں میری ہی نوع کے انساں

اگر مجھے ہے یہ فرصت کہ ان کا حال سنوں
مری نظر میں ہے وسعت کہ ان کے زخم گنوں
مرے قدم میں ہے طاقت کہ ان کے ساتھ چلوں
تو پھر مجھے بھی یہ حق ہے کہ ان سے بات کروں

وحید اختر

دیوار

تم نے ہم نے مل کر اس دیوار کی بنیادیں ڈالی تھیں
ہم نے یہ دیوار اٹھائی
ہم نے اس کی بنیادوں میں خوں چھڑکا
اپنے خوں، اپنے بوڑھوں اپنے بچوں کے خوں سے اس پر
اپنے گھر، اپنے اسباب، اپنی اقداریں آگ لگا کر اس دیوار کی اینٹوں کو فولاد کیا
یہ دیوار جسے ہم نے تم نے بے جان سمجھ رکھا تھا
روز بہ روز اونچی ہوتی جاتی ہے، اور نئی دیواریں
اس کی کوکھ سے پھوٹ رہی ہیں
یہ دیواریں پھن پھیلائے، سر اکڑائے راہ کو روکے بیٹھی ہیں
ہم تم ان کے ان داتا تھے لیکن اب ہیں ان کے گزیدہ
ہم تم اپنی بین لئے نفرت کے نغمے چھیڑ رہے ہیں
دیواریں پھن پھیلائے آنکھوں میں نفرت کی جوالا، سانسوں میں موت کا زہر لئے
آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہم کو دیکھ رہی ہیں
ایک طرف تم کھڑے ہو تنہا
دوسری جانب ہم تنہا ہیں
ہم تم دیواروں کی آنکھوں کے ہیں صید سحر زدہ

وحید اختر

ہم میں تم میں کچھ ایسے دیوانے ہیں جو نوکِ زباں سے
دیواروں کو چاٹ رہے ہیں
اور سمجھتے ہیں دیواریں گر جائیں گی
دیواریں ان پر ہنستی ہیں
ان کی زباں سے دیواروں پر جمے ہوئے خوں کا ہر قطرہ مانگ رہا ہے اور لہو، اور لہو
یا وہ دب کر پس جاتے ہیں
یا پھر ان کی زبانیں خوں کے تلخ، کسیلے ذائقے کی عادی ہو کر سو جاتی ہیں

اور زمیں یہ پوچھ رہی ہے
کیا یہ وہی انساں ہیں جن کو میں نے اپنی مٹی، اپنی روشنی اور ہواؤں کی
آغوش میں پالا
جن کو میں نے ایک ہی مٹی، ایک ہی سورج کی کرنوں کا دودھ پلایا
جن سے میں نے کہا تھا سورج چاند ستارے گردِ راہِ انساں ہیں
کیا یہ وہی انساں ہیں
جن کے قد سے جن کے بزرگوں جن کی تہذیبوں کے قد سے دیواریں اونچی ہیں

آج انسان اپنی پروردہ دیواروں کا قیدی ہے
آج انسان بہت چھوٹا ہے
اس کے قد سے دیواروں کا قد اونچا ہے۔

وحید اختر

معراج

نیند آنکھوں سے لگی بیٹھی ہے
نیم خوابیدہ نگاہوں نے سجا رکھے ہیں احساس کے آئینوں میں
ان گنت اوراق
ساری تصویریں ہیں دھندلائی ہوئی
مطلع ذہن پہ چھایا ہے دھندلکے کا سماں
خواب نادیدہ و دیدہ ہیں بہم رقص کناں

نیند کے در پہ ہوئی دستک سی
کس نے زنجیر خیالات کو جنبش دی ہے
جگمگانے لگے احساس کے آئینوں میں رنگیں اوراق
بول اٹھیں جاگتی سوتی ہوئی تصویریں بھی
مطلع ذہن سے پھوٹی شفق نور آثار
خواب نادیدہ نے آنکھوں سے ہٹائی چلمن
ماضی و حال نے آئندہ زمانوں کی حدوں میں جھانکا
پاؤں کی چاپ سے گونج اٹھا سراپردۂ خواب
کھنچ گئیں پھیلی فضاؤں کی، خلاؤں کی طنابیں اک بار

وحید اختر

چشم سیار و ثوابت سے لڑی ارض کی چشم بیدار
رقص افلاک بھی اب دست رس شوق میں ہے
خواب ہی خواب ہیں ہر سو رقصاں

جل گئے شہ پر جبریل کہیں سدرہ پر
اب ہے خود شوق سفر جادہ طراز و رہ بر

کب کا تکمیل کو پہنچا سفر ہفت افلاک
پھر بھی زنجیر تخیل میں ہے جنبش اب تک
اس سے آگے بھی ہیں شاید کئی نادیدہ جہاں منتظر چشم بشر۔

وزیر آغا

روایت

وہ ___ اک ریشمی کالے برقع میں لپٹی
دہکتے ہوئے اپنے گالوں کو باریک سی چلمنوں میں چھپائے
فقط دو بڑی موٹی موٹی سی آنکھوں سے
ہر آنے والے کو تکتی ہے
اور زخم کھا کر
لرزتی ہوئی کالی پلکوں میں خود کو چھپا کر
عجب بے بسی سے
پرانے سے اس کڑے آکاش کو گھورتی ہے!

وہ صدیوں سے
بڑھتے ہوئے وقت کے راستے میں
لبوں کو سئے دم بخود بے سہارا کھڑی ہے
مگر ایسے لگتا ہے جیسے
وہ ہر آنے والے کے شانے سے واقف ہے
ہر تند جھونکے کو پہچانتی ہے!!

وزیر آغا

لمحہ

رس بھرا لمحہ
نہ جانے کن کٹھن راہوں سے ہو کر
آج میرے تن کے اس اندھے نگر میں
ایک پل مہماں ہوا

رس بھرا لمحہ
سمے کی شاخ سے ٹوٹا
مری پھیلی ہوئی جھولی میں گر کر
آج میرا ہو گیا
یک بہ یک
قرنوں کے ٹھہرے کارواں نے جھرجھری لی چل پڑا
رس بھرے لمحے کا محمل
اونٹنی کی پشت پر مچلا
سنہری گھنٹیوں نے چیخ کر مجھ سے کہا
تو رہ گیا ——

المیہ

ں اب کہاں وہ ہوا
سنہری سی الھڑسی پگڈنڈیوں پر
مرے پیچھے پیچھے چلی — میں نے جس سے کہا
یوں نہ آ — دیکھ لے گا کوئی
وہ ہنسی — زہر میں ڈوبے ہونٹوں نے
مجھ سے کہا
تو — یونہی ڈرگیا
میں — ہوا
دور پربت پہ میرا نگر
اونچے آکاش پر میرا گھر
زرد پگڈنڈیوں سے مجھے واسطہ؟

اور میں بڑھتا گیا
اونچا اٹھتا گیا
دور پربت پہ پہنچا تو گونگا نگر
مجھ کو حیرت سے تکنے لگا —
سونے آکاش سے ٹوٹے کنگن کی کرچیں برسنے لگیں
نیچے پگڈنڈیوں پر بھی کوئی نہ تھا۔

وزیر آغا

ماں

خموشی کے اس زرد لمحے سے پہلے
یہ محسوس ہوتا تھا جیسے
کوئی غم زدہ بے نشاں چاپ
میرے تعاقب میں
اک نرم جھونکے کی صورت چلی آ رہی ہے
کوئی ہے — جو میرے عقب میں
محبت کی نم ناک خوش بو بکھیرے
اڑتے ہوئے تیز شعلوں سے مجھ کو بچائے
مرے ہر قدم کی "سلامت روی" کے لئے
التجاؤں دعاؤں کی برکھا میں خود
کو بھگوئے
مرے سر پہ آنچل کا سایہ کئے
آ رہا ہے!

اور اب دفعتاً
غم زدہ بے نشاں چاپ رک سی گئی ہے
تو لاکھوں بپھرتے قدم ان گنت تند دھارے
جو دبکے پڑے تھے
عقب سے ابھر کر
مری سمت تیزی سے بڑھنے لگے ہیں
جھپٹتے لپکتے — چلے آ رہے ہیں

وزیر آغا

سر پھرا

جلے خشک پتوں
کڑی دھوپ میں گھاس کے سوکھے تنکوں
ادھڑتی ہوئی کول کی گرم سڑکوں
کے بکھرے ہوئے سنگریزوں میں روئیدگی ڈھونڈتے ہو
عجب سر پھرے ہو!

دکھی شام کے ہانپتے کانپتے جھٹ پٹے میں
کسی کالے انجن کی دل دوز چیخوں کو سن کر
سیہ آہنی ریل کے پل پہ جھک کر
بڑے غور سے ہر گزرتے مسافر کو تم گھورتے ہو
عجب سر پھرے ہو!

بجھی رات کی بے صدا خامشی میں
کوئی چاند کی زرد قندیل لے کر
شکستہ مکانوں تھکے راستوں
ٹوٹی پھوٹی ہوئی خندقوں میں

وزیر آغا

کسی بیتے لمحے کو جب ڈھونڈھتا ہے
تمھیں دیکھتا ہے
تو تم ـــــ دفعتاً
اپنی چندھیائی آنکھوں پہ ہاتھ اپنے رکھ کر
بگڑ کر
بڑے زور سے کرب سے چیختے ہو
عجب سرپھرے ہو!!

وقار خلیل

بچپن سے بلوغ تک

ریگ زار تنہا ئیں
سوچتے خیالوں کی ڈور سے فلکتی ہیں
کس کی یاد کی بانہیں
ذہن کے جھروکوں سے یک بہ یک ابھرتا ہے
کس کا سیم گوں چہرہ :
رات ہو نہ ہو، وہ بھی
اپنے ہی خیالوں کی خیرگی سے ڈرتی تھی
جانے کن سرابوں میں خود کو بھینچ لیتی تھی
آپ اپنے زنداں میں وہ تھی یا کوئی محصور
صبح جب اسے دیکھا
آنکھ آنکھ بوجھل تھی، جوڑ جوڑ دکھتا تھا
رسمساتی بجلی تھی انگ انگ میں رقصاں
رنگ رخ تھا نکھرا سا:
طفلگی، نہ وہ شوخی، کم سنی نہ وہ جادو !
ہر نفس میں مستی تھی، انگ انگ میں خوش بو
عہد گل حیا پرور
زرد زرد پیراہن، شاخ آرزو کومل۔
یا شباب کی پہلی جگمگاتی منزل تھی !

وہاب دانش

غزل

میں بھی اک جلتا سورج دن کے پچھلے صحرا کا
سارا جیون بھٹکا ہوں پاؤں نے جب چلنا سیکھا

آج فضا میں رنگ کہاں درد کے کالے سائے ہیں
رات ڈروگے اور بہت ڈھل جانے دو شام ذرا

بھرے گھروں نے لوٹ لیا صدا لگانے والوں کو
اس دروازے کون گیا جس گھر میں، میں تنہا تھا

ان آوازوں، رنگوں میں، خوش بو بنتی سانسوں میں
میرا بھی کچھ حصہ ہے میں بھی ہوں تیرے جیسا

جن بانہوں نے بھینچ لیا رات مجھے تنہا پاکے
خود کو کیا سمجھاؤں میں وہ میرا ہی سایہ تھا

سب مٹی کے روپ وہی خوش بو ہنستی گاتی سی
شاخیں خود میں سمٹ گئیں جب ہاتھوں نے پھول چنا

جسم کی نازک سرحد سے دانش ہم محروم رہے
ہونٹ ہواؤں کے چومے وقت ترستے ہی گذرا

یوسف اختر

ایک نظم

ایک دن میں نے
سورج اور چاند کو
اپنے کمرے میں ایک کینوس پر چپکا دیا
پھر۔ پانی کی نوک سے دونوں کے
میں نے چار چار برابر ٹکڑے کر دیے
پھر۔ چاند اور سورج کے برابر کے دو ہلکے سبز دائرے
ایک دوسرے کینوس پر بنائے
اس کے بعد ایک ایک ٹکڑا چاند کا
اور ایک ایک ٹکڑا سورج کا
میں نے اٹھا کر دائروں پر اغل بغل یوں رکھ دیا کہ
دیکھنے والے پہلے چاند کے ٹکڑے کو دیکھیں
پھر۔ سورج کے،
اور اسی طرح میں نے جب دونوں دائرے مکمل کر لئے
تو خوش ہوا یہ سوچ کر
کہ اب کوئی بھی سورج اور چاند کو
ایک دوسرے سے کم نہیں سمجھے گا!

یوسف اختر

برف کی قاشیں....

برف کی قاشیں
گلاب کی پنکھڑیوں پہ رکھی ہیں
استخوانی زنجیریں
دودھ سے بھی گورے
پھولوں کی نس نس میں
پیوست ہو رہی ہیں
سورج کی اک تیز شعاع
ہولے ہولے
چاند کے اندر پگھل رہی ہے
سورج کی اک تیز شعاع
چاند کے اندر....
چاند کے اندر....